دوسرے اڈیشن مین غالباً اس کی زبان پر نظر ثانی نہین کی،

فنِ شاعری جناب اخلاق احمد ہلوی تقطیع اوسط، ضخامت ۱۹۲ صفحات کاغذ کتابت وطباعت معمولی،

قیمت مجلد عا ر غیر مجلد عہ، پتہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی نمبر ۶،

فن شاعری پر میر شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت مستند اور مشہور کتاب ہے، اس کا حدیقہ سوم اور چہارم علی الترتیب عروض اور قوافی پر ہے، لائق مؤلف نے جیسا کہ انھون نے لکھا ہے اردو مین اسکی تکمیل کی ہے یعنی ان قواعد کو اردو شاعری کے مزاج کے مطابق کرکے ان کی تلخیص کر دی ہے، اردو شاعری فارسی شاعری کا چربہ ہے اس لئے اس کے قواعد بیشتر وہی ہین، جو فارسی شاعری کے ہین لیکن اردو زبان پر ہندی کا اثر غالب ہے، اس لئے بعض جزوی امور خصوصاً اوزان وبحور مین کسی قدر اختلاف بھی ہے جس کی مصنف نے تشریح کر دی ہے، اس کتاب مین عروض وقوافی کے جملہ قواعد اور مسائل کی پوری تفصیل آگئی ہے اور اردو اشعار کی مثالون سے اسکی وضاحت وتشریح کر دی گئی ہے، کتاب کے شروع مین فنِ عروض کی اہمیت پر تبصرہ ہے، اور آخر مین شعر گوئی کے بعض اصول بتلائے گئے ہین جن سے شعر کہنے مین مدد ملتی ہے،

اردو عربی ڈکشنری مؤلفہ جناب مولوی ابوالفضل عبدالحفیظ صاحب بلیاوی تقطیع اوسط ضخامت ۵۴۴ صفحات کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۳ر، پتہ صغیر احمد صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء بادشاہ باغ لکھنؤ،

عربی اردو لغت کی بعض کتابین موجود ہین لیکن اردو سے عربی مین کوئی ایسی کتاب نہین تھی جس سے طلبہ کو عربی ترجمہ وانشا مین مدد مل سکے، مؤلف نے جو عربی لغت وادب کا ذوق اور اس پر اچھی نظر رکھتے ہین اردو عربی ڈکشنری لکھ کر ایک بڑی علمی وتعلیمی ضرورت کو پورا کیا ہے، لغت کا فن ایسا وسیع ہے کہ تمام لغات کا احاطہ ایک مختصر کتاب مین دشوار ہے اور اس قسم کی تعلیمی ضرورت کی کتابون مین اس کامل استقصاء کی ضرورت بھی نہین ہے، مگر اس کتاب مین عام استعمال کے تمام الفاظ آگئے ہین اور جدید لغات بھی دیدیئے گئے ہین، جو عربی ترجمہ وانشا کیلئے بالکل کافی ہین، اور اس سے طالب علمون اور عربی کے مترجمین کو بڑی سہولت ہوگی،

"م"

جلد ۷۴ ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۴ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

—————— ۔۔۔۔۔۔۔۔ ——————

شذرات

دن گننے نے دیر نہین لگتی گذشتہ ۲۲ نومبر کو حضرۃ الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کو ایک سال پورا ہوگیا، مگر اپنے اثرات کے لحاظ سے آج بھی یہ حادثہ تازہ معلوم ہوتا ہے، اور قدم قدم پر اُس کی یاد آتی ہے، گو وفات کے کئی سال پہلے سے دار المصنفین سے اُن کا ظاہری تعلق منقطع ہوگیا تھا، مگر اس سے اُن کی قلبی و روحانی وابستگی آخر دم تک قائم رہی، وہ دونون ایسے لازم ملزوم ہین کہ ایک کے تصور سے دوسرے کا تصور جدا نہین ہوسکتا، اور دار المصنفین کے در و دیوار پر انھی کا جلوہ نظر آتا ہے اور جبتک اُس کا وجود باقی ہے، اُن کا یہ نقش قائم رہے گا، آج بھی دار المصنفین کے ذرہ ذرہ سے اُن کی یہ روحانی صدا سنائی دیتی ہے کہ

آغشتہ ایم دامن صحرا بخون دل   قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

دار المصنفین تو اُن کی سراپا یادگار ہے، اُن کے لئے اور کسی یادگار کی ضرورت نہین ہے، مگر اُن کا وطن دیسنہ ضلع پٹنہ یقیناً اُن کی یادگار قائم کرنے کا مستحق ہے، وہان اُردو کا ایک بڑا کتب خانہ ہے، جو اس خصوصیت مین ہندوستان کے تمام کتبخانون مین ممتاز ہے کہ اس مین اردو کی تقریباً تمام مطبوعہ کتابین، بہت سے نادر قلمی نسخے اور مشہور اخبارات و رسائل کے مکمل فائل موجود ہین، اردو کا اتنا بڑا ذخیرہ ہندوستان کے کسی کتبخانہ مین نہین مل سکتا، اردو کے شائقین دور دور سے اس کتبخانہ کو دیکھنے کیلئے آتے ہین،

اس کتبخانہ سے حضرت مرحوم کو بڑی دلچسپی تھی، اور اسکی ترقی مین اُن کا بڑا ہاتھ تھا، اب ان کے اہل وطن اُن کی یادگار مین اس کتبخانہ سے متعلق ایک سلیمان ہال تعمیر کرنا چاہتے ہین، جس کے مصارف کا تخمینہ اٹھارہ ہزار روپیے ہے، اس کیلئے ہندوستان کے مشاہیر علم و قلم کی جانب سے ایک اپیل شائع ہوئی ہے، حضرت مرحوم کی جیسی عظیم المرتبت شخصیت کی یادگار کے لئے یہ بہت معمولی رقم ہے جس کو صرف اُن کے عقیدتمندون کا حلقہ آسانی سے فراہم کرسکتا ہے، اس لئے یقین ہے کہ اس کیلئے عام چندہ کی بھی ضرورت نہ ہوگی، اور حضرت کے متوسلین خاص اس کو فراہم کردین گے، تاہم جو لوگ اس کام مین شرکت کرنا چاہین وہ پروفیسر سید حسن رضا صاحب دیسنہ ضلع پٹنہ کے نام چندہ بھیجین،

بڑے انتظار کے بعد مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی تفسیر کا دوسرا حصہ شائع ہوا ہے، اس حصہ مین سورۂ مائدہ سے سورۂ توبہ تک کی تفسیر ہے، اس کے پہلے حصہ کے ریویو مین اس تفسیر کی خصوصیات کا تفصیلی ذکر کیا جاچکا ہے، یہ خصوصیات اس حصہ مین بھی موجود ہین، کلام مجید مین جن قدیم اقوام و مذاہب، ان کے انبیاء و رسل، اُن کی اُمتون کے عقائد و اعمال کا حال، اشخاص و مقامات کا تذکرہ ہے، اُنکی تاریخی حیثیت پر غیر محتاط مفسرین اور اسرائیلی روایات نے پردے ڈال دیئے ہین، اس تفسیر مین تاریخ مذاہب قدیم، تاریخ و جغرافیہ اور اثری اکتشافات سے کلام مجید کے بیانات کی تائید، اس کے اجمالی اشارات کی تشریح اور ان سے متعلق آیات کی محققانہ تفسیر کی گئی ہے، جس سے اردو کیا عربی تفسیرین بھی خالی ہین، اور یہ فاضل مفسر کا وہ کارنامہ ہے جس کی مثال پورے تفسیری ذخیرہ مین نہین مل سکتی، اسی کے ساتھ اُن کا محتاط قلم کہین بھی جادۂ مستقیم سے ہٹنے نہین پایا ہے، اس معنوی خصوصیت کیساتھ یہ تفسیر تاج کمپنی کے روایتی حسن و نفاست سے بھی آراستہ ہے، اس کی قیمت ۱۳ روپے ہے، تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی، لاہور اور ڈھاکہ سے ملے گی،

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور اُن کے علمی و مذہبی کارنامون پر اردو مین بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، مگر اُن سے پہلے کے مسلمان حکمران خانوادون یعنی غلامون، خلجیون، تغلقون اور لودیون کے ان حالات پر بہت کم لکھا گیا ہے، اسلئے ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے ان تمام خاندانون کے علمی و مذہبی کارنامون اور ان کے دربارون سے متوسل علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء کے حالات مین ایک سلسلہ لکھا ہے، جس کی پہلی جلد جو غلام سلاطین کے حالات مین ہے، چھپ کر تیار ہوگئی ہے، اور امید ہے کہ آیندہ مہینہ شائع ہوجائے گی،

شبلی کالج میں مولانا شبلی کی وفات کی یادگار میں ہر سال نومبر میں شبلی ہفتہ منایا جاتا ہے جس میں مختلف تقریبات ہوتی ہیں، اس سال زیادہ اہتمام سے یہ یادگار منائی گئی، اور دوسری تقریبات کیساتھ ایک ادبی کانفرنس بھی ہوئی، جس میں پروفیسر آل احمد سرور اور سید احتشام حسین صاحب نے شرکت کی، سرور صاحب نے مولانا شبلی مرحوم کے علمی وادبی کارناموں اور نئے ادبی رجحانات پر بڑی ادیبانہ وشاعرانہ بلکہ ساحرانہ مگر نہایت محتاط اور متوازن تقریر کی احتشام صاحب نے زبان اور رسم الخط کے تعلق اور اردو کے رسم الخط کے مسئلہ پر ایسی سنجیدہ، مدلل، سلجھی ہوئی اور شگفتہ اور دلچسپ بحث کی کہ سامعین کو موضوع کی خشکی کا مطلق احساس نہ ہونے پایا، دونوں تقریریں بہت پسند کی گئیں، دونوں اصحاب دار المصنفین میں ٹھہرے تھے، اس لئے ایک دن بڑی پر لطف صحبت رہی،

آنریبل ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر ترقیات ریاست بہار اپنے قومی وملکی خدمات، ایثار وقربانی اور قابلیت وتجربہ کے لحاظ سے اس کے مستحق تھے کہ مرکزی حکومت میں اُن کے خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے، اس لئے حکومت نے اُن کو مرکزی کابینہ میں شامل کرکے اپنی ہوشمندی اور حق شناسی کا ثبوت دیا ہے، اور یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے تجربہ اور قابلیت سے ملک کو فائدہ پہنچے گا، موصوف دار المصنفین کے پرانے مخلصین اور ہمدردوں میں ہیں، اور مجلس دار المصنفین کے صدر بھی ہیں اس لئے ارکانِ دار المصنفین کو بھی اس حسنِ انتخاب سے بڑی مسرت ہوئی، اور وہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں،

معارف کے پاکستانی خریدار اب تک اس کا چندہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لاہور کو بھیجتے تھے اور شیخ صاحب خندہ پیشانی کیساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے، مگر اُن کی زحمت کے خیال سے اب یہ انتظام بدل دیا گیا ہے اور پاکستان کے خریداروں سے گذارش ہے کہ آیندہ سے وہ اپنا چندہ منیجر مکتبۃ الشرق آرام باغ شرقی کراچی کے پتہ پر بھیجا کریں،

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی عہدے، خطابات وامتیازات

از

سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

اعلیٰ کمانڈر بادشاہ بادشاہ وقت خود فوج کا اعلیٰ سردار ہوتا تھا، حکومت کی تمام فوج اسی کے ماتحت ہوتی تھی، وہ دوسرے فوجی عہدیداروں کی طرح میدانِ جنگ میں بھی شریک ہوتا تھا، غزنویوں کے عہد سے لیکر تیموریوں کے آخری دور تک کوئی حکمران ایسا نہیں گذرا جس نے جنگ میں شرکت نہ کی ہو، شمس الدین التتمش کا حریف یعنی سندھ کا آزاد حکمران ناصر الدین قباچہ، ابراہیم لودی اور شیر شاہ سوری تو میدانِ جنگ ہی میں جان بحق ہوئے،

شہزادے اگر بادشاہ کسی سبب سے میدانِ جنگ میں شریک نہ ہوسکتا تھا تو شہزادے اسکی قائم مقامی کرتے، سلطان غیاث الدین بلبن کا محبوب فرزند شہزادہ محمد سلطان مغلوں سے لڑتا ہوا مارا گیا[1]، سلطان جلال الدین خلجی کے لڑکے ارکلی خان نے ایک لشکر جرار کے ساتھ اودھ کے حاکم ملک چھجو کی بغاوت فرو کی[2]، سلطان علاء الدین خلجی کے لڑکے خضر خان نے راجپوتانہ کی مہم کی رہنمائی کی[3]، سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں شہزادہ جونا خان نے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ص ۱۰۹ [2] ایضاً ص ۱۸۲ [3] تاریخ مبارک شاہی از یحییٰ سرہندی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ص،،

تلنگانہ اور ارنگل فتح کئے،[۱] سلطان محمد تغلق نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی ماتحتی مین ایک بڑی فوج تمام معزز افراد کے ساتھ قراجیل کی مہم پر روانہ کی،[۲]

تیموری دور مین شہزادون کو اس وقت تک کوئی منصب ہی نہین ملتا تھا، جب تک وہ کسی مہم مین شریک نہ ہوتے تھے، شہزادہ سلیم اکبر کا بہت ہی چہیتا بیٹا تھا لیکن وہ بھی میواڑ کے رانا کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا گیا، اکبر کا دوسرا لڑکا شہزادہ مراد تو دکن کے فوجی کیمپ ہی مین مرا، جہانگیر کے زمانہ مین شہزادہ خرم نے میواڑ اور دکن کی متواتر لڑائیون مین جو نمایان کام کئے، وہی اس کے تخت و تاج کے حاصل کرنے مین معاون ہوئے، شہزادہ پرویز، میواڑ، مانڈو، خاندیس، اور برار کی صوبہ پر بھیجا گیا، شاہجہان کی حکومت مین دارا قندھار کی مہم پر ۰۰، ۱۰ منصبدارون کے ساتھ گیا،[۳] دکن کی تسخیر کے لئے شہزادہ شجاع بھی بھیجا گیا، اسی عہد مین بیجاپور گولکنڈہ، بلخ اور قندھار کی مہمون مین شاہی فوج کی کمان شہزادہ اورنگ زیب کے ہاتھ مین تھی، شہزادہ مراد جب بلخ و بدخشان کے لئے روانہ کیا گیا تو سلطنت کے ۰۰، ۲۷ فوجی سردار اس کے ساتھ تھے، اورنگ زیب کے عہد مین شہزادہ معظم نے ۱۰۶۶ھ مین مرہٹون اور بیجاپور کے خلاف فوج کشی کی، ۱۰۹۳ھ مین شہزادہ اعظم پرتگالیون کے خلاف جنگ کرنے کے لئے گوا بھیجا گیا، ۱۱۰۷ھ مین شہزادہ کام بخش دکن کی مہم پر روانہ کیا گیا،

جانشینی کی جنگ مین شہزادے اپنی ہی کمان مین فوج کو لے کر میدان مین اترتے تھے، ان مین بہت سے لڑتے ہوئے مارے بھی گئے، شہزادہ ہندال ہمایون کی حمایت مین قندھار کے محاصرہ مین جنگ کرتا ہوا مارا گیا، دارا میدان جنگ مین تو نہین لیکن جنگ کے بعد گرفتار ہو کر قتل ہوا، اورنگ زیب کے لڑکون مین اعظم شاہ اور کام بخش کی جانین لڑائی ہی مین تلف ہوئین، بہادر شاہ اول کے بعد شہزادہ عظیم الشان، رفیع الشان، جہان شاہ اور فرخندہ اختر جنگ ہی مین مارے گئے،

---

[۱] تاریخ مبارک شاہی ص ۹۳، ۹۴، و برنی ص ۴۴۶ [۲] تاریخ مبارکشاہی ص [۳] عمل صالح از محمد صالح کنبوہ، جلد دوم ص ۲۶۳،

معزز عہدیدار

اس زمانہ مین سلطنت کا انتظامی اور فوجی نظام کچھ ایسا ملا جلا تھا کہ بعض اوقات فوجون کی کمان ان معزز عہدیدارون کے بھی سپرد کر دی جاتی تھی، جو سول یعنی انتظامی فرائض انجام دیتے تھے، مثلاً سلطان ناصر الدین محمود کے عہد مین الغ خان جب امیر حاجب تھا تو وہ ۶۴۴ھ مین کوہ جود اور نندنہ کی مہم مین شاہی لشکر کی باگ اپنے ہاتھ مین لے کر روانہ ہوا،[۱] اور جب ناصر الدین محمود کا نائب مملکت ہو گیا تو بھی اہم مہمات مین فوجین اسی کی نگرانی مین بھیجی جاتی تھین، علاء الدین خلجی کے زمانہ مین نصرت خان وزیر تھا، لیکن گجرات اور نہروالہ کی تسخیر اسی نے کی،[۲]

انتظامی معاملات مین علاء الدین خلجی کا نائب ملک کافور تھا، لیکن جب دیوگیر شاہی فوج بھیجی گئی تو ملک کافور ہی اس کا سر لشکر تھا،[۳] قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے عہد مین ملک دینار ظفر خان گجرات کا والی مقرر ہوا تو اسی کی فوجی رہنمائی مین گجرات کے سارے علاقے فتح کئے گئے،[۴] اسی عہد مین خسرو خان وزیر بھی تھا، اور سر لشکر بھی، تمام ملکی معاملات اسی کے مشورے سے طے پاتے تھے، اور فوجین بھی اسی کے ماتحت تھین، اور بڑی بڑی مہمون پر اسی کی نگرانی مین لشکر روانہ کیا جاتا تھا،[۵] فیروز شاہ کے عہد مین خانجہان تاتار خان، ملک نائب باربک ابراہیم خان، عماد الملک بشیر سلطانی رزم و بزم دونون مین اپنے سپاہیانہ کمال اور دانشمندانہ تدبر کا جوہر دکھلاتے تھے،[۶] فیروز شاہ نے لکھنوتی مین جنگ کی تو لڑائی کے میدان مین فیروز شاہ کا وزیر ملک دیوان تیس ہزار سوارون کے ساتھ میمنہ کا سردار مقرر کیا گیا تھا،[۷]

غرض انتظامی اور فوجی عہدیدارون کی خدمات ضرورت کے وقت بزم و رزم دونون مین حاصل کی جاتی تھین، ہر صوبہ کا گورنر جو اقطاع دار یا مقطع یا والی یا نائب وزیر کہلاتا تھا، اپنے علاقہ کا فوجی کمانڈر

---

[۱] طبقات ناصری ص ۲۰۹ [۲] برنی ص ۲۴۱-۲۳۹ [۳] برنی ص ۳۲۶ [۴] برنی ص ۳۸۰، [۵] برنی ص ۳۹۱ [۶] تاتار خان لکھنوتی کی جنگ مین تیس ہزار بہادر سوارون کے ساتھ قلب لشکر مین متعین تھا، اور وہی سر لشکر تھا۔ [۷] تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف تیسرا مقدمہ،

بھی ہوتا تھا،

تیموری دور مین بھی انتظامی عہدیدار فوجی خدمات انجام دیتے رہے، ہمایون اور اکبر کے عہد مین بیرم خان وکیل السلطنت[1] یعنی وزیر اعظم کے عہدہ پر مامور تھا، لیکن میدان جنگ مین اسی کی نبرد آزمائی کی وجہ سے تیموری سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوئی، بیرم خان کے بعد خانخانان منعم خان وکیل السلطنت ہوا تو انتظامی امور کے ساتھ فوجی مہم مین بھی شریک ہوتا تھا، چنانچہ اکبر اپنے چھٹے سال جلوس مین جب شرقی خلاف عبو لشکر کشی کی تو اس کے ساتھ منعم خان بھی تھا،[2] شمس الدین محمد خان آتکہ وکیل السلطنت کے عہدہ پر فائز ہوا تو ابو الفضل کا بیان ہے،

"تنظیم معاقد مالی و ملکی و انصرام مہام سپاہی و رعیت برائے آن خود گرفتہ محفل آرائے غلبۂ اقبال شد" (اکبر نامہ جلد دوم ص ۱۴۹)

جہانگیر کے زمانہ مین شریف خان وکیل ہوا تو اس کو امیر الامراء کا بھی خطاب ملا، اور وہ دربار کا سب سے زیادہ جلیل القدر امیر سمجھا جاتا تھا، جہانگیر کے چوتھے سال جلوس مین شہزادہ پرویز دکن کی مہم پر ملک عنبر کے خلاف بھیجا گیا تو اس کے ساتھ ملک الامراء وکیل السلطنت شریف خان بھی تھا،[3]

شاہجہانی عہد کے وکیل السلطنت آصف خان نے بیجاپور مین عادل شاہیون کے خلاف شاہی فوج کی رہنمائی کی،[4]

صوبہ کا حاکم اعلیٰ جو سپہ سالار، یا صوبہ دار یا ناظم کہلاتا تھا، اپنے صوبہ کا اعلیٰ فوجی کمانڈر بھی ہوتا تھا، سپہ سالار کے بہت سے فرائض کی تفصیل آئین اکبری مین ہے، ان فرائض مین سے ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ فوجون کا نگہبان ہوتا تھا،

---

[1] مآثر الامراء جلد اول ص ۳۷۵ [2] اکبر نامہ جلد دوم ص ۱۴۰ [3] اقبال نامہ جہانگیر ص ۳۶۳ [4] بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری ص ۱۲، ۱۱۴

"جانشین خدیو عالم است، سپاہ و صوبہ و رعیت فرمان پذیرد" (آئین اکبری ص ۱۹۵)

جب کبھی اس پاس کے علاقہ مین بغاوت ہو جاتی تو اس کو وہی اپنی نگرانی مین فرو کرتا، یا قرب و جوار مین کوئی فوجی مہم بھیجی جاتی، تو اسی کی رہنمائی مین بھیجی جاتی، ضرورت کے وقت مرتبہ اور ناظم دار السلطنت مین طلب کرلئے جاتے، اور دور دراز علاقون کی اہم فوجی مہم پر بھیجے جاتے،

عارض | بادشاہ اور شہزادون کے بعد غزنوی دور مین اعلیٰ فوجی عہدہ دار صاحب دیوان عرض یا عارض کہلاتا تھا، وہ جنگی اور حربی امور مین بادشاہ کا خاص مشیر ہوتا تھا، اس کی حیثیت وزیر جنگ کی ہوتی جس کا رتبہ وزیر اعظم سے کچھ ہی کم تھا، لشکر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اسی پر ہوتی تھی، وہ ہر سال فوجی معائنہ کرتا تھا، اور سلطنت کی تمام فوجین آراستہ و مسلح ہو کر اس کے سامنے سے گذرتی تھین، اس موقع پر اکثر سلطان بھی موجود رہتا تھا،

عارض کے پاس ایک رجسٹر ہوتا تھا، جس مین فوج کی حاضری، بیماری اور موت کی تفصیل درج رہتی تھی، اس کی ایک نقل دیوان رسالت مین بھی حوالہ کے لئے رکھی جاتی تھی، سلطان جب کسی مہم پر جاتا تھا، تو عارض فوجی کیمپ مین لشکریون اور اُن کے جانورون کے خورد و نوش کا سامان اور دوسری ضروریات بھی پورا کرتا تھا، نقل و حمل مین سہولتین بہم پہنچانا بھی اس کے ذمہ ہوتا، جنگ کے بعد مال غنیمت کا بھی وہ محافظ ہوتا تھا، جو سلطان کے سامنے حسب مراتب تمام لشکریون مین تقسیم کر دیا جاتا تھا،

عارض کا مددگار نائب عرض ہوتا، جو تنخواہین تقسیم کیا کرتا تھا، ہر صوبہ کی فوج کے لئے ایک عارض، اور ایک نائب عارض ہوتا، دونون مرکزی حکومت کے عارض کے ماتحت ہوتے، احتیاطاً صوبہ کے عارض کا ایک لڑکا دار السلطنت مین ضمانت کے طور پر روک لیا جاتا تھا،[1]

غلامون خلجیون اور تغلقون کے زمانہ مین عارض کا عہدہ تو قائم رہا لیکن اس کی حیثیت کچھ بدل گئی، عارض جو کبھی عرض ممالک بھی کہلاتا[2]

---

[1] بیہقی جلد اول بحوالہ محمود آف غزنہ، مؤلفہ ڈاکٹر محمد ناظم ص ۱۳۲، ۱۳۷ [2] تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی ص ۴۲۳، ۴۴۸، ۱۹۷، ۱۷۴،

یا دیوان عرض[50] یا سرلشکر ملک کہلاتا تھا، قریب قریب وہی فرائض انجام دیتا تھا، جو غزنویوں کے عہد میں اس کے ذمے تھے، مگر وہ وزیر حرب نہ رہا، اگرچہ جنگ کے سلسلہ میں مجلس مشاورت میں ضرور شریک رہتا تھا، وہ خود کوئی حکم صادر نہ کرتا، بلکہ بادشاہ کے احکام کو عمل میں لاتا تھا، وہ جب خود کسی کو مقرر یا برطرف کرنا چاہتا، تو بادشاہ کی اجازت کے بغیر نہ کرتا، کسی مہم کے لئے لشکر تو وہ تیار کرتا تھا، مگر سرلشکر بادشاہ مقرر کرتا تھا، یہ عہدہ ہر زمانہ میں بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا، اور اس پر ہمیشہ بڑے معزز امراء مامور کئے جاتے تھے، سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں اس عہدہ پر امیر خسرو کے نانا عماد الملک فائز تھے، ان کا لقب عرض ممالک کے بجائے راوت عرض تھا،[51] بلبن کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ فوج کے سلسلہ میں جو چاہتے تھے کرتے تھے، بلبن مداخلت نہ کرتا تھا،[52] لیکن خود عماد الملک کو اپنے عہدے کی ذمہ داری کا غیر معمولی احساس تھا، چنانچہ ایک موقع پر اپنے لشکریوں اور ماتحتوں کو مخاطب کر کے کہا،

"میں بادشاہوں کی ملک داری کا نگہبان ہوں اور مددگار ہوں، کیونکہ انھوں نے اپنی ساری فوج میرے ہاتھ میں دے دی ہے، اور فوج کے تمام معاملات (حل وعقد، قبض وبسط) میرے سپرد ہیں، اگر میں لشکر کے کام میں غفلت کروں، اور لشکریوں کی فراہمی کی شب و روز فکر میں نہ

[50] تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف ص ۳۴۴، ۲۹۸، دبرنی ص ۱۱۴، ۶۰، ۴۴۴ [51] ڈاکٹر وحید مرزا نے اپنی انگریزی کتاب لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو کے ص ۲۹ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مرہٹی اور گجراتی زبان میں راوت کے معنی "سوار" "گھوڑا رکھنے والا" ہیں، راوت عرض غالباً اضافت مقلوبی کے ساتھ عرض راوت ہو، رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن (اکتوبر ۱۹۳۳ء) کے ایک مقالہ نگار کا خیال ہے کہ راوت ہندوؤں کی ایک قوم ہے، عماد الملک نسلی حیثیت سے راوت تھے، اس لئے راوت عرض کہلاتے، لیکن یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی [52] بلبن عماد الملک کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ

"در دیوان عرض از خلق النان باشد"

(برنی ص ۱۱۵)

رہوں، اور ان کو اپنے بھائیوں اور لڑکوں سے بہتر نہ سمجھوں تو دنیا میں حرامخور کہلاؤں گا، اور قیامت کے روز خداوند تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہوں گا"

(برنی ص ۱۱۶)

سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں عارض کا لقب عماد الملک ہی ہو گیا تھا، اس عہدہ پر سلطان کا ایک غلام بشیر مامور تھا، جس نے اپنے اعلیٰ کردار اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے سلطان کے مزاج میں بڑا درخور حاصل کر لیا تھا، اس کے اس عہدہ کا بڑا اعزاز اور وقار تھا، عماد الملک محل میں جہاں اور جب چاہتا آجا سکتا، اور سلطان سے ہر قسم کی گفتگو کر سکتا تھا، جس کو چاہتا جاگیر دلوتا، جس کو چاہتا، معزول کرا دیتا، اس کے ساتھ پانچ ہزار سوار اور پہلوان برابر رہتے تھے، اور وہ خود بھی شاہی لشکر کی فلاح و بہبود میں برابر کوشاں رہتا، شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں ہے، (ص ۴۴۰)

"سر لشکر جیوش حضرت فیروز شاہ بود، برائے غم خوارگی زمرۂ حشم و فرقہ خدم کوشش بسیار می نمود در مدت چہل سال بر ہیچ یاری ذرہ ظلم نہ کردہ"،

عارض کا مددگار نائب عارض کہلاتا تھا[51]

میر بخشی یا بخشی الممالک | تیموری دور میں عارض کا عہدہ میر بخشی یا بخشی الممالک کہلاتا تھا، اس کے فرائض کی نوعیت عارض ہی جیسی تھی لیکن یہ عہدہ عزت و وقار کے لحاظ سے بہت اہم ہو گیا، اس لئے فرائض میں بھی کچھ اضافہ ہوتا رہا،

عارض کی طرح وہ لشکریوں کو بھرتی کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا، سپاہیوں کی حاضری، غیر حاضری، رخصت، تنخواہوں کی حقیقت یادداشت، تعلیقہ، لشکریوں کی برطرفی، علامات، اور موت کی تصحیح، سواروں کی چہرہ نویسی وغیرہ[52] کی ساری تفصیلات اسی کے دفتر میں جو توجیہ کہلاتا موجود رہتی تھیں، اہل کشک یعنی شاہی محل کے محافظوں کا بھی نگران میر بخشی ہی ہوتا تھا،[53]

[51] برنی ص ۴۴۳ [52] آئین اکبری جلد اول دفتر دوم آئین ۴ و ۵ [53] اکبر نامہ جلد سوم ص ۸۲۱

جب منصب داری نظام قائم ہوا تو تمام منصب داروں کی فہرست میر بخشی ہی کے پاس ہوتی، اسی کی وساطت سے ہر منصب دار بادشاہ کے حضور مین پیش کیا جاتا[1] اسی لئے وہ شاہی دربار مین بادشاہ کے تخت کے داہنی جانب کھڑا رہتا، کبھی کبھی وہ شاہی محل کے اندر بھی گفت و شنید کیلئے طلب کیا جاتا، فوجی خدمات کے سلسلہ مین جاگیرین دی جاتی تھین، ان مین شاہی فرمان پروانون کے ساتھ بخشی کی مہرین بھی ثبت کی جاتین، اسی طرح پروانچے اور برات پر بھی اس کی مہرین ہوتی تھین[2]

ہر منصبدار کے لشکری اور گھوڑے، تصحیحہ (چہرہ نویسی) اور داغ کے معائنہ کے لئے میر بخشی کی خدمت میں پیش کئے جاتے[3]، ان کامون کو انجام دینے کے لئے میر بخشی کے ماتحت بخشی، داروغہ، امین اور مشرف معاون ہوتے،[4]

جب کوئی لشکر میدان جنگ کو جاتا، تو میر بخشی میدان جنگ کا نقشہ تیار کرکے بادشاہ کی خدمت مین پیش کرتا، اور لشکر کے ہر بازو پر منصبدارون کو وہی متعین کر دیتا،[5]

فوجی کیمپ کے ساتھ بھی میر بخشی ہوتا، اراکین دربار اور منصبدار اسی کی اجازت سے بادشاہ کی خدمت مین باریاب ہوتے،[6]

کوچ کرتے وقت راستہ کی ساری دقتین میر بخشی ہی کے ذریعہ سے دور کی جاتین، جہانگیر جب احمد آباد سے آگرہ آرہا تھا، تو دریائے مہی مین کشتیان دستیاب نہ ہو سکین، چنانچہ میر بخشی خواجہ ابو الحسن نے تین دن مین ایک پل تیار کرایا، جس کے ذریعہ لشکریون نے دریا کو عبور کیا، جہانگیر اس پل کا ذکر کرتا ہے،

"واز آنجا بمنزل پیش شتافتہ از پلے کہ بر بالائے مہی بستہ شدہ بود، عبور فرمودم با آنکہ درین

---

۱ دستور الانشا، مؤلفہ یار محمد، مطبوعہ کلکتہ، ص ۳۰۱ ۲ آئین اکبری جلد اول دفتر دوم، آئین ۱۱، ۱۲،

۳ آئین اکبری جلد اول، دفتر دوم آئین ۶، ۸ ۴ مرآۃ احمدی مطبوعہ بمبئی جلد دوم ص ۱۱۰ ۵ دستور الانشا ص ۳۰۱،

۶ آئین اکبری، آئین، دفتر اول، آئین ۱۷،

دریا کشتی نبود کہ پل توان بست وآب بغایت عمیق و تندی گذشت، بحسن اہتمام خواجہ ابو الحسن میر بخشی پیش از دو سہ روز پلے در نہایت استحکام کہ طول یک صد و چہل درعہ و عرض چہار درعہ است مرتب گشتہ بجہت امتحان فرمودم کہ فیل گن سندر خاص را کہ از فیلان کلان قوی ہیکل است با سہ مادہ فیل از روے پل گذرانیدند، بنوعے مستحکم بستہ شدہ بود کہ قوایم از بار فیل کوہ ہیکل اصلاً متزلزل نگشت"

(تزک جہانگیری، مطبوعہ نولکشور پریس ص ۲۴۴)

کبھی میر بخشی فوجی مہم کی بھی رہنمائی کرتا، مثلاً اکبر کے میر بخشی شہباز خان نے قلعہ سوانہ (جودھپور) کی تسخیر کی، پھر صوبہ بہار مین راجہ گجپتی کے خلاف لشکر کشی کی تو جگدیش پور اور شیر گڈھ کے قلعہ کو فتح کیا، اسی مہم مین قلعہ رہتاس کو بھی زیر نگین کیا، رانا پرتاب کے خلاف بھی وہ جا کر لڑا،[1] اکبر کے میر بخشی شیخ فرید نے تو اپنے ایک دلیرانہ کارنامہ سے تیموری سلطنت کے وارثون کی قسمت ہی بدل دی، اکبر بستر مرگ پر تھا کہ میرزا عزیز کوکہ اور راجہ مان سنگھ نے شہزادہ خسرو کی بادشاہت کا اعلان کرنا چاہا، لیکن شیخ فرید شہزادہ سلیم کی قیامگاہ پر پہنچا، اور اس کو بادشاہ تسلیم کرکے مبارکباد پیش کی، تمام امرا نے شیخ فرید کی اتباع کیا، شہزادہ سلیم سریرآرائے سلطنت ہوا، جہانگیر نے شیخ فرید کو صاحب السیف والقلم کا خطاب دے کر اس کو اپنی حکومت کا بھی میر بخشی بنایا، اور اسی کی نگرانی مین شہزادہ خسرو کے تعاقب کے لئے شاہی فوج بھیجی،[2]

شاہجہان نے بلخ کی تسخیر کے لئے شہزادہ مراد کو روانہ کیا، تو اس مہم مین میر بخشی اصالت خان شاہی فوج کے دست راست کے طرح کا نگران تھا،[3] میدان جنگ مین لشکر کے ہر بازو مین ایک ایک بخشی بھی ہوتا تھا، میر بخشی کے مددگار و معاون مختلف بخشی ہوتے تھے، جو بخشی دوم و بخشی سوم کہلاتے تھے، جن کے فرائض میر بخشی ہی کے حکم سے متعین ہوتے تھے، احدیون کا ایک علیحدہ بخشی ہوتا تھا،[4] جہانگیر کے زمانہ مین ایک عہدہ بخشی حضور کا بھی تھا، جو غالباً ہمیشہ بادشاہ کے ہمرکاب رہتا تھا، شاہی شاگرد پیشہ کے لئے بھی ایک بخشی

---

۱ مآثر الامرا، جلد دوم ص ۴۰۱-۵۹۰ ۲ مآثر الامرا، جلد دوم ص ۳۷۰، ۴۲۲ ۳ ایضاً جلد اول ص ۱۷۱ ۴ آئین اکبری جلد اول دفتر دوم آئین ۴،

ہوا کرتا تھا[50] جس کے لئے کوئی معزز درباری منتخب کیا جاتا تھا،

میر بخشی کا عہدہ وکیل السلطنت کے بعد سب سے زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا، اسکی حیثیت دیوان سے کم نہ ہوتی تھی، عام طور سے کسی بڑے معزز منصب دار کو اس عہدہ پر مامور کیا جاتا تھا جس کے بعد وہ کسی صوبہ کا ناظم یا سپہ سالار بنا دیا جاتا، یا دیوان ہی مقرر ہو جاتا، وہ صاحب قلم اور صاحب سیف دونوں ہوتا، فرخ سیر کے زمانہ میں حسین علی خان میر بخشی کے عہدہ پر مامور ہوا، تو اس کے فوجی کارناموں کے صلہ میں اس کو امیر الامراء بہادر فیروز جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا، اور وہ سلطنت کے انتظامی اور فوجی معاملات کے تمام جزو کل پر حاوی رہا[51]،

سپہ سالار | غزنویوں کے دور میں عارض کے بعد دوسرا اعلیٰ فوجی عہدیدار سپہ سالار ہوتا تھا، جو ہر صوبہ میں علحدہ علحدہ مقرر کئے جاتے تھے، محمود غزنوی کے زمانہ میں خراسان کی سپہ سالاری اس کے بھائی نصر اور پھر یوسف کے سپرد تھی، بقیہ ہر صوبہ میں ایک ترکمانی سپہ سالار مقرر ہوتا تھا،

سپہ سالار کے ماتحت عہدے | غزنویوں کے عہد میں سپہ سالار کے نیچے حاجب ہوتا تھا، اس کے ماتحت سرہنگ ہوتا تھا جس کی نگرانی میں پانچ گھسوار ہوتے، اس کے بعد قائد کا عہدہ تھا، جو ایک سو سوار کا سردار ہوتا تھا، اس کے نیچے خیل تاش ہوتے جن کے ماتحت دس دس سوار رہتے تھے[52]،

عہد سلاطین دہلی کے دوسرے فوجی عہدے | سلاطین دہلی کے زمانے میں سپہ سالار کا عہدہ اعلیٰ نہیں سمجھا جاتا تھا، دس سواروں کا سردار سرخیل کہلاتا تھا، دس سرخیل ایک سپہ سالار کی نگرانی میں رہتے تھے، دس سپہ سالار ایک امیر کے ماتحت ہوتے تھے، دس امیر ایک ملک اور دس ملک ایک خان کی سرداری قبول کرتے تھے، ایک خان لاکھ سوار، ایک ملک دس ہزار سوار، ایک امیر ایک ہزار سوار، ایک سپہ سالار، ایک سو سوار

---

۵۰ مثال کے لئے دیکھو ماثر الامرا جلد اول ص ۱۷۵، ص ۳۱۱ ۵۱ ماثر الامرا جلد اول ص ۳۲۴ ۵۲ بیہقی ص ۲۹۷، ۳۲۳، ۴۴۹، ۴۳۶، ۴۲۲، ۴۳۰ وغیرہ بحوالہ محمود آف غزنہ از ڈاکٹر محمد ناظم ص ۱۴۲،

اور ایک سرخیل دس سوار رکھتا تھا[53]، بادشاہ کی عدم موجودگی میں جو خان کسی مہم میں لشکر کی رہنمائی کرتا، وہ سرلشکر کہلاتا[54]، لڑائی کے موقع پر ہر صف کے لئے ایک علحدہ خان رہتا تھا، اگلی صف کا نگران مقدم یا سرلشکر مقدمہ، میمنہ اور میسرہ کے نگہبان علی الترتیب سرفوج میمنہ اور سرفوج میسرہ کہلاتے تھے[55]، قلب میں خاصہ خیل یعنی بادشاہ کے خاص محافظوں کی نگرانی سرجاندار کرتے تھے، جو قلب کے دونوں بازوؤں پر ہوتے تھے، اس لئے سرجاندار میمنہ اور سرجاندار میسرہ کہلاتے تھے[56]، لشکر کے شاہی غلمان کے سردار امیر غلمان کے ماتحت ہوتے تھے[57]، قربیگ یعنی شاہی علم بردار بھی ایک ممتاز فوجی عہدیدار تھا، جو میمنہ اور میسرہ میں متعین کیا جاتا تھا[58]، سہم الحشم اور شحنۂ حشم غالباً پیادوں کے نگران ہوتے[59]، ہر لشکر کے ساتھ ایک قاضی اور امیر داد یا دادبک بھی ہوتا، قاضی نماز کی امامت کرتا، اور امیر داد یا دادبک لشکریوں کے باہمی جھگڑے چکاتا[60]، ہر لشکر کے ساتھ ایک کیفیت نویس بھی ہوتا، جو فوج کی تمام کیفیات بادشاہ کو لکھ بھیجتا تھا[61]، غزنویوں کے زمانے میں اس کام کا انجام دینے والا صاحب برید کہلاتا تھا، میدان جنگ میں شاہی علم کے محافظ کو علم دار بھی کہتے تھے،

شاہی اصطبل کا داروغہ امیر اخور یا اخربک کے لقب سے ملقب ہوتا، وہ فوج کے گھوڑوں کا افسر اعلیٰ بھی سمجھا جاتا، اس عہدہ پر بہت ہی معزز ملک یا خان مقرر ہوتا تھا[62]، ہاتھیوں کے نگران کا خطاب تختہ بیل تھا[63]، اور اونٹوں کے نگہبان کو شحنۂ نفر کہتے تھے[64]، آلات حرب کے محافظ کا لقب سرسلاحدار تھا، شاہی جھنڈوں کا نگران قوربیگ کہلاتا تھا،

---

۵۳ تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی ص ۱۴۵، ۵۴ ایضاً ص ۴۶۶، ۴۴۱ ۵۵ ایضاً ص ۲۶۰ ۵۶ تاریخ مبارک شاہی ص ۶۲ ۵۷ برنی ص ۳۰۱ ۵۸ تاریخ مبارک شاہی ص ۶۲ ۵۹ ایضاً ص ۶۲ و برنی ص ۳۰ ۶۰ برنی ص ۳۶۱، ۳۵۸ ۶۱ برنی ص ۳۳۱ ۶۲ تغلق نامہ ص ۱۲۹ ۶۳ جلال الدین خلجی تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے بھتیجے اور داماد الغ خان کو آخر بک بنایا (برنی ص ۱۷۷) ۶۴ محمود غزنوی کے زمانہ میں ہاتھیوں کے نگران کو مقدم پیلبانان کہتے تھے ۶۵ تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف ص ۳۳۷، ۳۴۰،

تموریوں کی فوج کا نظم ونسق منصبداری نظام پر قائم تھا لیکن عہدے تقریبًا وہی رہے، جو سلاطین دہلی کے عہد میں تھے، البتہ نام اور کام کی نوعیت میں کچھ تھوڑا تھوڑا سا فرق پیدا ہوتا گیا، مثلًا اس دور میں شاہی اصطبل کے نگران کو آختہ بیگی اور ہاتھیوں کے افسر اعلیٰ کو داروغہ فیل خانہ اور اونٹوں کے انچارج کو داروغہ شترخانہ کہتے تھے، البتہ اس عہد میں توپ اور آتشین اسلحہ کی کثرت ہوئی تو فوج میں اس کا علٰحدہ شعبہ قائم کیا گیا، جس کا افسر اعلیٰ میر آتش مقرر ہوا، جو داروغۂ توپ خانہ بھی کہلاتا تھا.

القاب واحتیازات غزنویوں کے ابتدائی دور میں سب سے زیادہ معزز لقب امیر کا تھا، غزنین کے فرمانروا امیر ہی کہلاتے تھے، مثلًا امیر سبکتگین، امیر آلتگین، امیر بلکاتگین وغیرہ، محمود نے تخت پر بیٹھنے کے بعد جب سلطان کا لقب اختیار کیا، تو امیر کا خطاب اس کے لڑکوں کے لئے مخصوص ہو گیا لیکن مسعود کے زمانہ میں امیر ارکان سلطنت اور فوجی سرداروں کا لقب ہو گیا، چنانچہ مسعود کا وزیر حسنک جس نے بہت سے معرکے سر کئے، امیر کے لقب سے ملقب تھا،

غوریوں نے شروع میں اپنے نام کے ساتھ امیر ہی استعمال کیا، مثلًا امیر فولاد غوری شنسبی، امیر بنجی ابن بہاران شنسبی، امیر سوری بن محمد، وغیرہ لیکن بعد میں ملک کا لقب اختیار کیا، مثلًا ملک قطب الدین الحسن بن محمد بن عباس، ملک عزالدین الحسین بن الحسن ابوالسلاطین، ملک ناصرالدین الحسین محمد المادینی الخ، معزالدین سام المعروف بہ شہاب الدین غوری کے نام کے ساتھ ملک کا لقب استعمال نہیں ہوا، اس کے زمانہ میں ملک اور امیر عام طور سے ارکین سلطنت اور فوجی سرداروں کا لقب تھا، اور ملک میں سب سے زیادہ معزز فوجی خطاب تھا اور امیر اس سے کچھ کم درجہ کا تھا،

التتمش کے بعد سے خان کا لقب سب سے زیادہ معزز سمجھا جانے لگا، بلبن سے لیکر شیر شاہ تک ہر فرمانروا کے لڑکوں کے نام کے ساتھ خان کا لقب استعمال ہوا، بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدداروں کو بھی اسی لقب سے ملقب کیا جاتا، فوجی سرداروں کے لئے خان سے پہلے کچھ ایسے اسمائے صفت استعمال کئے جاتے تھے جن سے

اُن کی جنگی شوکت وعظمت اور فوجی دبدبہ کا اظہار ہوتا تھا، مثلًا قتلغ خان، الغ خان، کزل خان، بغرا خان، طغرل خان، الپ خان، کت خان، ظفر خان، شیر خان، نصرت خان وغیرہ کبھی خان کو زیادہ معزز بنا کر خانخانان کر دیا جاتا، مثلًا خانخانان اختیار الدین (جلال الدین خلجی کے لڑکے کا لقب تھا) خانخانان حسام الدین خسرو خان (ناصرالدین کے بھائی کا خطاب تھا) خانخانان بہلول لودی (سلطان بہلول لودی کا تخت نشین ہونے سے پہلے کا خطاب تھا، جو خاندان سادات کے بادشاہ محمد شاہ نے دیا تھا) خانخانان لوحانی اور خانخانان ہیبت خان (یہ دونوں سلطان سکندر لودی کے فوجی سردار تھے) کبھی خان کو خان اعظم یا خان معظم یا خان جہان بنا کر بھی موقر کیا جاتا تھا، مثلًا خان اعظم الغ خان (سلطان بلبن کا بادشاہ ہونے سے پہلے کا لقب تھا) خان معظم تاتار خان اور خان جہان دونوں فیروز شاہ تغلق کے معزز ارکان سلطنت اور فوجی سردار تھے،

ملک خان سے اور امیر ملک سے نسبتًہ کمتر درجہ کا لقب تھا، صبح الاعشیٰ کا مصنف محمد تغلق کی فوج کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ لشکر کا اعلیٰ عہدیدار خان ہوتا ہے، اس کے بعد ملک، پھر امیر، پھر سپہ سالار، پھر عام لشکری، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ فوج کا اعلیٰ عہدیدار خان کا لقب نہ رکھتا تھا، مثلًا معزالدین بہرام شاہ کے زمانہ میں نظام الملک مغلوں کے خلاف فوج لے کر گیا لیکن وہ خان کے لقب سے ملقب نہیں تھا، علاء الدین خلجی کے زمانہ میں ملک کافور بہت بڑا فوجی سردار تھا، لیکن اس کے نام کے ساتھ خان کا لقب کبھی استعمال نہیں ہوا، محمد تغلق کے دور میں فیروز کی سرداری میں بہت سے خطے تسخیر ہوئے، لیکن اس کا خطاب ملک نائب باربک ہی رہا، مگر ایسی مثالیں کم ہیں، عام طور سے اعلیٰ فوجی عہدیدار خان کے لقب سے ضرور سرفراز کئے جاتے تھے،

سادات لودیوں، اور سوریوں کے زمانہ میں ملک اور امیر نظر نہیں آتے ہیں، ان کے دور میں یہ القاب ختم کر دیئے گئے تھے، اور ہر فوجی عہدہ دار خان ہی کے لقب سے ملقب ہوتا تھا، ہندو بھی خطابات سے سرفراز کئے جاتے تھے، ان کو رائے یا راؤ کا خطاب ملتا تھا، بلبن کے عہد

کے ذکر میں مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ

"و رایان و راؤ و گان و مقدمان آمدہ در گاہ را خاکبوس کنانیدندی"

(تاریخ فیروز شاہی ص ۳۱)

علاء الدین خلجی نے دیوگیر کے مفتوح راجہ رام دیو کو رائے رایان کا خطاب دیا، (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۲۶)

بابر کے ساتھ جو فوجی سردار ہندوستان آئے، ان کے نام کے ساتھ کوئی خاص لقب نہ تھا، اس نے پانی پت اور کنواہا کی لڑائیوں میں فتح پانے کے بعد بھی اپنے فوجی سرداروں کو کسی خطاب اور لقب سے سرفراز نہیں کیا، لیکن ہندوستان کے بعض امراء کو خطابات دیئے، مثلاً جب ۱۵۲۴ء میں ہندوستان پر تیسری بار حملہ آور ہوا، اور دہلی فتح کئے بغیر کابل واپس چلا گیا، تو دولت خان کے لڑکے دلاور خان کو اس کی فوجی خدمات کے صلہ میں خانخانان کا خطاب دیا، اسی طرح فتح خان سروانی المخاطب بہ اعظم ہمایونی کو خانجہان کا لقب دیا، اس کو یہ پسند نہ تھا کہ ہمایوں کا نام اس کے لڑکے کے سوا کسی اور کا ہو، مگر بابر کے نئے خطابات کا عطا کرنا ایک عجیب بات تھی، وہ خود ہی لکھتا ہے،

"ہندوستان میں دستور ہے کہ جن امراء کا مرتبہ دربار شاہی میں بڑھایا جاتا ہے، اُن کو مقررہ خطاب بھی دیئے جاتے ہیں، ان ہی خطابوں میں سے ایک خطاب اعظم ہمایوں ہے، ایک خانجہان ہے اور ایک خانخانان ہے، اس کے (یعنی خواجہ فتح خان سروانی) باپ کا خطاب اعظم ہمایوں تھا، چونکہ شہزادہ کا نام ہمایوں تھا، اس لئے اب خطاب کو میں نے موقوف کر دیا، اور فتح خان سروانی کو خانجہان کا خطاب دیا گیا،

(بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۹۹)

ہمایوں نے بھی ہندوستان کے پیشرو مسلمان فرمانرواؤں کی روایت کے مطابق یہاں کے امراء اور فوجی سرداروں کو خطاب دینے شروع کئے، مثلاً اجہ کے ایک زمیندار کو اسکی خدمات کے صلہ میں خان جہان کا خطاب[1] دیا، اس نے اپنے محبوب رفیق اور غمگسار بیرم بیگ کو خانخانان کے لقب سے سرفراز کیا، طبقات اکبری

[1] تذکرۃ الواقعات ہمایونی از جوہر انگریزی ترجمہ میجر چارلس اسٹورٹ ص ۱۰۱،

میں ہے :-

"او (یعنی بیرم) در ملازمت حضرت آشیانی بمرتبہ خانخانانی و امیرالامرائی رسیدہ بمنصب اتالیقی شاہنشاہ عالی مقدار اکبر شاہ امتیاز یافتہ بود[1]"

ہمایوں کے ہندوستانی فوجی سردار بدستور سابق خان رہے، اور اس کے باپ کے عہد کے بعض سرداروں کے نام کے آگے بھی خان کے لقب کا اضافہ ہوا، مثلاً عبداللہ خان[2] اوزبک، شاہ ابو المعالی، علی قلی خان[3] شیبانی بہادر خان[4]، حاجی محمد خان[5] تردی بیگ خان[6]،

اکبری دور کے بعد سے خان معزز اور خانخانان بہت ہی معزز لقب ہو گیا، ہر دور میں ایک خانخانان ہوتا تھا، مثلاً اکبر کے زمانہ میں خانخانان بیرم خان، اس کے بعد خانخانان منعم خان اور خانخانان عبدالرحیم تھے، جہانگیری عہد میں مرزا عبدالرحیم ہی خانخانان رہا، شاہجہانی حکومت میں مہابت خان اور یمین الدولہ آصف خان خانخانان ہوئے، عالمگیری دور میں نواب منعظم خان خانخانان تھا، جو میر جملہ کے نام سے مشہور تھا، بہادر شاہ اول کے وزیر اور سپہ سالار منعم خان کا لقب خانخانان بہادر ظفر جنگ ہوا،

تیموری دور سے پہلے سلاطین کے عہد کی طرح خان کو زیادہ موقر بنانے کے لئے کبھی خان جہان، خان دوران، خان زمان، خانِ عالم، خانِ اعظم، اور خان معظم کر دیا جاتا تھا، اور توصیفی اسماء کا بھی اضافہ ہو جاتا تھا، مثلاً بلند خان، دلاور خان، فدائی خان، مقرب خان، صف شکن خان، رعد انداز خان، زبردست خان، ہمت خان، وغیرہ،

اکبر نے ہندوؤں سے بھی فوجی خدمت لی، اور ان کو خطابات دیئے، جو تین قسم کے تھے، (۱) رائے رایان، (۲) رائے، (۳) راجہ، رائے رایان، امیرالامراء اور خانخانان کے برابر تھا، رائے، اور راجہ خان کے مساوی ہوتے تھے، رائے کے ساتھ توصیفی اسماء لگانے کا بھی دستور تھا، مثلاً سر بلند رائے[7]،

[1] طبقات اکبری جلد دوم ص ۲۵۴ [2] ایضاً جلد دوم ص ۵۲ [3][4][5][6] برص ۱۳۲، ۱۳۲، ۱۴۱، ۱۴۱ [7] اقبال نامہ جہانگیری اردو ترجمہ ص ۱۴۱

مناصب ان خطابات کے علاوہ اکبر نے مختلف فوجی مناصب قائم کئے جو دوازدہ ہزاری سے دہ باشی تک تھے، ہر تیموری شاہزادہ کے لئے فوجی مہم پر جانا ضروری تھا، اس لئے فوجی سردارون کی طرح اس کے بھی مناصب مقرر ہوتے تھے،

اکبر کے عہد مین ہفت ہزاری سے اوپر کے مناصب شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھے، اکبر نے پہلے شاہزادہ سلیم کو دہ ہزاری، مراد کو ہفت ہزاری اور دانیال کو شش ہزاری منصب عطا کیا، لیکن بعد مین سلیم کو دوازدہ ہزاری، مراد کو نہ ہزاری، اور دانیال کو ہفت ہزاری بنایا، اور دوسرے مناصب کا اعزاز امراء اور فوجی سردارون کے لئے تھا، شروع مین اکبر کے اعلیٰ فوجی عہدیدار پنج ہزاری سے زیادہ مناصب پر فائز نہین ہوئے، لیکن آخر مین راجہ مان سنگھ، میرزا شاہرخ، عزیز خان کوکہ اور خان معظم ہفت ہزاری منصب سے سرفراز کئے گئے،

اکبری دور کے بعد مناصب کی تعداد بڑھتی گئی، جہانگیر کے عہد مین شہزادہ خرم کا منصب سی ہزاری تھا، اور جب جہانگیر اس سے ناخوش ہوا، تو اس نے شہزادہ پرویز کا منصب چہل ہزاری کر دیا، شاہجہان کے عہد مین داراشکوہ کا بھی یہی منصب رہا،

امراء اور فوجی سردارون مین کسی کا منصب ہفت ہزاری سے نہین بڑھا، البتہ جہانگیر اور شاہ جہان کے خسر اعتماد الدولہ اور آصف الدولہ دونون کا منصب نہ ہزاری تھا، وہ شاہی خاندان ہی کے افراد سمجھے جاتے تھے،

اکبر کی حکومت کے آخری دور سے منصب مین کچھ ترمیم اور اضافہ بھی ہوتا گیا، مثلاً پہلے صرف پنجہزاری، چہار ہزاری، سہ ہزاری وغیرہ مناصب تھے، لیکن پھر اُن کے ساتھ سوار کے منصب کا بھی اضافہ ہونے لگا، مثلاً پنجہزاری، پنج ہزار سوار، پہلا منصب ذات کہلاتا تھا، اور دوسرا منصب سوار، منصب ذات اصلی منصب ہوتا تھا، جس کے حساب سے منصب دار کو جاگیر اور تنخواہ ملتی تھین، منصب سوار کی تعداد کے

لحاظ سے منصبدار کو سوار رکھنا پڑتا تھا، اس قسم کے منصب کے تین درجے تھے، اول، دوم، سوم، اگر سوارون کی تعداد منصب کے اعداد کے برابر ہے، مثلاً پنجہزاری، پنجہزار سوار تو یہ منصب اول درجہ کا شمار کیا جاتا تھا، اگر سوارون کی تعداد منصب کے اعداد سے نصف یا نصف سے زیادہ ہے، مثلاً پنج ہزاری، چہار ہزار سوار یا پنج ہزاری سہ ہزاری سوار تو یہ دوسرے درجہ کا منصب سمجھا جاتا تھا، اور نصف سے بھی کم ہوا تو یہ تیسرے درجہ کا منصب ہوتا تھا،

سہ ہزاری سے ہفت ہزاری منصب مین ترقی یک ہزاری ہوتی تھی، مثلاً سہ ہزاری کو چہار ہزاری ہو جاتا تھا، یک ہزاری کو دو ہزاری و پنج صدی منصب مین پنج صدی اور اس سے نیچے والے منصب مین یک صدی کی ترقی ہوتی تھی،

جہانگیر کے زمانہ مین سوار کے منصب کے ساتھ یک اسپہ دو اسپہ و سہ اسپہ کے امتیاز کا بھی اضافہ ہوا، مثلاً سہ ہزاری سوار یک اسپہ، سہ ہزاری سوار یک اسپہ، دو اسپہ، پنج ہزاری کا پنج ہزار دو اسپہ، سہ اسپہ، جن سے غالباً یہ مراد تھی کہ ایک منصب دار اپنے سوارون کی مقررہ تعداد کو ایک ایک دو دو اور تین تین گھوڑون کے ساتھ رکھ سکتا تھا، جہانگیری عہد مین ایسے منصب دار امراء بہت کم تھے لیکن شاہجہانی دور مین بہت زیادہ ہو گئے، بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۵ کی عبارتون کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہین کہ شاہجہان کے عہد مین پنجہزاری منصب والون کو کم از کم ۶۰۰ سہ اسپہ، ۱۲۰۰ دو اسپہ اور ۲۰۰ یک اسپہ سوارون کو داغ کے لئے پیش کرنا پڑتا تھا، یعنی چھ سو سہ اسپہ سوار اٹھارہ سو گھوڑے اور بارہ سو دو اسپہ سوار چوبیس سو گھوڑے، اور دو سو یک اسپہ سوار دو سو گھوڑے رکھتے تھے، یعنی ایک منصبدار کے دو ہزار سوار کے پاس ۴۴۰۰ گھوڑے ہوتے تھے،

اس منصبداری نظام مین رفتہ رفتہ اتنی پیچیدگیان پیدا ہوتی گئین کہ آج ان کو سمجھنا آسان نہین، اور جو شخص بھی اس کو سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، وہ ایک مختلف نتیجہ پر پہونچتا ہے، مختصر یہ کہ منصب ذات ایک اعزاز تھا، اور پھر سوار، اور یک اسپہ، دو اسپہ و سہ اسپہ کا منصب مزید امتیاز تھا، شاہجہان کے زمانے مین یمین الدولہ آصف خان خانان کو نہ ہزاری، نہ ہزار سوار، دو اسپہ، سہ اسپہ، خان دوران

بہادر نصرت جنگ و ہفت ہزاری، ہفت ہزار سوار پنج ہزاری سوار، دو اسپہ، سہ اسپہ، سید خان جہان بارہہ کو شش ہزاری، شش ہزار سوار، دو اسپہ، سہ اسپہ کے مناصب حاصل تھے،

انعامات ان مناصب کے علاوہ فوجی سردار مختلف قسم کے انعامات سے بھی سرفراز کئے جاتے تھے،

تیموریون سے پہلے فوجی سردارون کو اُن کے کارنامون کے صلہ مین کوئی جاگیر یا علاقہ یا کوئی بڑا عہدہ دیاجاتا تھا، اور ان مین امتیازی شان پیدا کرنے کے لئے ان کو جھنڈے بھی دیئے جاتے تھے، صبح الاعشیٰ کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک خان سات جھنڈے کا استعمال کر سکتا تھا، اور امیر کو تین جھنڈے استعمال کرنے کی اجازت تھی،

تیموری دور مین بھی فوجی سردارون کو جاگیر، علاقے اور عہدے دیئے جانے کا دستور قائم رہا، اس کے ساتھ اور شاہانہ عنایتون سے بھی نوازا جاتا تھا، مثلاً جب کوئی فوجی سردار کسی مہم پر جاتا یا وہان سے فاتح وکامران واپس آتا تو اس کو مناصب کے علاوہ مختلف قسم کے انعامات بھی دیئے جاتے، جو حسب ذیل ہوتے،

(۱) نقد رقم (۲) خلعت جس مین چارقب، سقرلاتی لباس، عبائے زر دوزی، قبائے طلا دوزی، دستار زر دوزی، طرہ مروارید، کمر بند مسلسل مروارید، سرپیچ، بالابند، ارکلان، تسبیح مرصع وغیرہ ہوتی (۳) ہتھیار مثلاً شمشیر مرصع، جمدھر مرصع، خنجر مرصع، جیغۂ مرصع، کلغی مرصع، پھول کٹارہ وغیرہ (۴) فیل و اسپ با زین مطلا یا نقرہ و با یراق طلا و نقرہ (۵) نقارہ لوازم شاہی مین داخل تھا، لیکن تیموریون نے اپنے فوجی سردارون کو بھی یہ امتیاز عطا کیا، یہ اعزاز عموماً دو ہزاری منصب کے اوپر والے فوجی سردارون کو حاصل ہوتا تھا، جب بادشاہ خود لشکر کے ساتھ ہوتا تھا تو اس کے نقارہ کے سوا کسی اور کا نقارہ نہین بجتا تھا، اس کے محل اور قیامگاہ کے حدود مین بھی کسی کا نقارہ نہین بجایا جا سکتا تھا، البتہ جہانگیر کے زمانے مین نورجہان کے باپ اعتماد الدولہ کے لئے یہ مخصوص رعایت بھی کہ اس کا نقارہ پائے تخت مین بھی بجا کرتا تھا[1] (۶) علم و نشانات مین علم، چتر، توق، تو بادشاہ کے لئے مخصوص تھے، لیکن تمن توق اور جھنڈا فوجی سردارون کو اعزاز کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی جاتی،

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۵۰،

مینا بازار مرتبہ ڈاکٹر محمد احمد

پر

ایک نظر

از

جناب محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری،

یادش بخیر! مینا بازار یا تو اس وقت ناتمام سی پڑھی تھی، اور پڑھی کیا تھی بر دوستی چشم و گوش ذہن و دماغ مین ٹھونسی تھی جب اُستاد کی مار اور والدین کی ڈانٹ سے جبراً پڑھنی پڑی تھی، یا اب پڑھنی پڑی ہے، جب میرے لائق محترم دوست ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی ایم اے لکچرار عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی نے مقدمہ اور شرح سے مزین کرکے چھپوائی، اور اس کا ایک نسخہ یہ کہکر مجھے دیا کہ تجھے اس پر ریویو بھی لکھنا ہے، مین نے معذرت بھی کی کہ ریویو ایسے شخص سے لکھایا جاتا ہے جو خود شہرت کا مالک ہو، جس کی تحریر سے کتاب کی وقعت لوگون کی نظرون مین کچھ زیادہ ہو، مجھے ایک محدود حلقۂ احباب کے ماسوا اور جانتا کون ہے، ؟ بقول غالب:

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
ورنہ شہر مین غالب کی آبرو کیا ہے

مگر ڈاکٹر محمد احمد نے چونکہ مجھے دوستی کی عینک سے دیکھا ہے، اور اُن کی نظر مین میرے پہلے کے چند مضامین و تصانیف بھی ہین، اس لئے میری ایک نہ چلی، اور ریویو کی فرمائش طوق گلو بن کر رہی، یہ گفتگو ماہ مئی ۳۸ء کی تھی، مگر خانہ کاہلی خراب کہ آج بھی جب اکتوبر کا نصف گذر چکا، اور اس پر متعدد موافق و مخالف ریویو بھی نکل چکے،

اور بعض چھپ بھی گئے ہین، اس طوق سے اپنی گلو خلاصی نہ کر سکا،

مین نے اپنا یہ تبصرہ "یادش بخیر" کے لفظ سے جو شروع کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب جب کہ ڈاکٹر محمد احمد کے پہلے مضمون "مینا بازار کا مصنف" مطبوعہ معارف اشاعت مئی ۱۹۵۳ء کے جواب مین ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایم اے پی ایچ ڈی لکچرار عربی و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کا مضمون اسی عنوان سے معارف کی اشاعت ہائے جولائی اور اگست مین نکل چکا، پھر مینا بازار پر ڈاکٹر نذیر صاحب کی تقریظ و تنقید بھی معارف اشاعت ستمبر مین چھپ چکی تو جو شخص بھی ڈاکٹر محمد احمد کی کتاب پر ریویو لکھے گا، اس کے لئے دو باتین ناگزیر ہونگی، ایک تو یہ کہ ان دونون ہی مصنفین کے مضامین سے کچھ نہ کچھ تعرض کرنا اور دونون ہی پر کچھ نہ کچھ کلام کرنا پڑے گا، ایک کے ذکر کے ساتھ اب دوسرے کا ذکر کرنے سے وہ بچ نہین سکتا، دوسری یہ کہ اس بحث مین جہان اُس نے کچھ بھی لکھا کہ اُسے بھی کسی ایک طرف سے کچھ نہ کچھ ضرور سننا پڑے گا، اس لئے کہ گو ایک کی طرف رجحان سے اس کی نیت دوسرے پر اعتراض کی نہ ہو، صرف اپنی پسند کا اظہار اور بعض امور پر تعجب کا اظہار ہی ہو تاہم فریق ثانی اُسے اعتراض سمجھ کر جواب دے گا، اور دے گا، اس طرح مجھے بھی ہدف ملامت غالبًا بننا پڑے گا، یہان مجھے اپنے استاد حضرت اصغر گونڈوی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر یاد آتا ہے، جو اس بحث کے موقف مین میرے حسب حال ہے کہ

مائل شعر و غزل پھر ہے طبیعت اصغرؔ ابھی کچھ اور مقدر میں ہے رسوا ہونا

بہر حال یہ دیکھ کر کہ کتاب زیر بحث پر صرف ایک ریویو منظر عام پر آیا، اور وہ بھی ایسا جو اس کتاب کو اور اس کے مصنف کو سر سے پیر تک عیوب سے بھرا ہوا بتاتا ہے، خیال ہوا کہ اس کی خوبیان بھی تو ظاہر کی جائین، اس لئے مین جو کچھ لکھتا ہون اس کتاب کی خوبیان ہی اجاگر کرنے کے لئے لکھتا ہون،

عیب دیکھنے کے لئے تو کچھ جذبہ اپنے اوپر طاری کرنا پڑتا ہے، حُسن دیکھنے کے لئے نہین، حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ کے ساتھ ایک آدمی کچھ عرصہ تک رہا، جب چلنے لگا تو اُس نے ابن ادہمؒ سے کہا "اس عرصہ مین

آپ نے میری جو بُرائی دیکھی ہو براہ کرم بتا دیجئے کہ اس کی اصلاح کر لون، ابن ادہمؒ نے کہا مین نے تو تم کو صرف دوستی کی نگاہون سے دیکھا ہے" اس لئے مین نے تمھارے عیب نہین صرف محاسن دیکھے، عیب پوچھنا ہو تو دنیا بھری پڑی ہو کسی سے بھی پوچھ لینا"

بس اسی نقطۂ نظر سے مین بھی صرف اس کتاب کی خوبیان دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہون کہ عیوب دیکھنے والے تو اور بھی ہین، یہ اگر جرم ہے، تو مین خوش ہون کہ دوستی کا جرم ہے، عناد و بغض کا نہین،

ع اُنس سے اور اَن سے ترکیب ہے انسان کی

البتہ بعض جگہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا ذکر جو آئے گا، تو وہ محض ضمنًا ہوگا،

۱- کتاب مینا بازار فارسی ادب نثر کی ایک مشہور کتاب ہے، جو ابھی نصف صدی قبل تک مکاتب کی درسیات مین لازم سمجھی جاتی تھی، اس زمانہ کی کتب فارسی درسی گلستان، بوستان، مینا بازار، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، انشاء ابو الفضل، وقائع نعمت خان عالی ادبیات عالیہ کا نصاب اور متداول تھین، ان مین سے بعض کی تو متعدد شرحین بھی لکھی گئین،

لیکن گذشتہ سو برس مین اہل ہند کو دو بار (۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء) قیامت صغرا سے دوچار ہونا پڑا، اور حشر قیامت کبریٰ کی تصدیق اور اذعان دونون مین کچھ زیادہ کرنے ہی کے لئے یہ نمونے قدرت نے دکھائے،

آشوب گاہ حشر مجھے کیون عجیب ہو جب آج دیکھتا ہون تری رہگذر کو مین (اصغر)

مشرقی اقوام پر مغربی قوم کا مسلط ہونا سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے کسی طرح کم نہ تھا، مسلمانون کی حکومت گیا، اہل عقل اور مت بدل گئی، علم و حکمت بدل گئی، حالت بدل گئی، تہذیب بدل گئی، تمدن مین تغیر آگیا، سکون کی جگہ حرکت نے لے لی، حرکت سے ترقی اور ترقی کی ہماہمی سے ہنگامہ رونما ہوا، ایمان کی جگہ مادیت آئی، قدیم اقدار حیات مین یکسر انقلاب آگیا، غرض مختلف تغیرات کے سلسلہ مین معیار کمال بھی بدلا، اور نصاب تعلیم بھی پرانی درسیات گم ہونے لگین، تاہم کتاب زیر نظر مینا بازار (گو کم رائج ہی، لیکن پھر بھی) اس کا فارسی ادب مین ابھی

وہی وجہ ہے کہ جس یونیورسٹی میں بھی یہ داخل ہوگی، وہاں بی اے یا ایم اے ہی کے نصاب میں ہوگی، اور کیوں نہ ہو کہ یہ کتاب نثر دقیق و رنگین کی ایک عمدہ مثال ہے، کیا بلحاظ الفاظ، اور کیا بلحاظ معانی و خیال، اور کیا بلحاظ طرزِ تحریر و حسنِ نگارش، یہ کتاب عام فہم نہ تھی کہ نیچے کے درجوں کے لائق سمجھی جاتی، عبارت میں شعری وزن نہ ہونے کی وجہ سے اگر دیکھئے تو اسے نثر ہی کہیں گے، لیکن اگر الفاظ کی رنگینی اور شیرینی پر نظر ڈالیے گا، یا تخیل کی سجاوٹ اور بناوٹ کا لحاظ کیجئے گا، تو آپ کو اس پر نظم کا دھوکا ہونے لگے گا، توالیِ اضافات، تتابعِ صفات، مفرد، و مرکب تشبیہات پیچ در پیچ استعارات، برجستہ کنایات، دلکش مجازات نے کتاب کو گویا ایک آئینہ خانہ یا بنی سنوری دلھن بنا دیا ہے اس میں شک نہیں کہ تلازموں کی قید اور صنائع کی کثرت کے باعث کتاب کچھ بے مقصد سی ہو کر رہ گئی ہے اور جا بجا کہیں کہیں کافی دماغی کشتی اور ذہنی زور آزمائی کے بعد بھی معنی و مطلب کنوئیں کی تہ میں تارا بن کر رہ گیا ہے تاہم چونکہ اس کے زمانۂ تصنیف میں (اور اس کے کافی بعد تک) یہی طرزِ نگارش مروج اور استعدادِ علمی کا معیار سمجھی جاتی تھی، اور بیشتر کتب ادبیہ کے درس کا مقصد عبرت و نصیحت یا پیامِ عمل کے بجائے صرف فارسی محاورات پر عبور اور روزمرہ کی صحت، امثال و طرزِ ادا کی مشق ہوتا تھا، (اور ادب کا یہ فائدہ بھی کچھ کم نہیں ہے) اس لئے مصنفین سے لیکر طلبہ تک سب لوگ اغلاق و اغراق ہی کو پسند کرتے، صلاتِ افعال کے تغیر سے معنوی رنگا رنگی تلازموں اور صنعتوں سے لفظی بوقلمونی ہی کو ادراک اور استعمال کرنے اور سیکھنے سکھانے کی طرف پوری توجہ مبذول کرتے تھے،

۲- لیکن عجیب بات ہے کہ بقول ڈاکٹر محمد احمد :-

"جتنی ہی یہ کتاب اہلِ علم میں مقبول ہے معروف ہے، اتنی ہی اس کے مصنف کی شخصیت مشتبہ اور مجہول ہے"

یعنی کوئی اسے میر واضح کی بتاتا ہے، کوئی ملا ظہوری کی، اور یہ اختلاف جہاں تک ڈاکٹر محمد احمد اور ڈاکٹر نذیر دونوں ہی صاحبان کی تحریروں سے میں سمجھ سکا ہوں کچھ اس طرح تقسیم ہوتا رہا ہے کہ

الف: اہلِ مطابع تو بلاشبہہ اسے میر مبارک اللہ ارادتخان واضح کی بتاتے رہے،

ب: اربابِ شروح و فرہنگ و لغات اسے بلا استثناء برابر ملا ظہوری کی لکھتے رہے،

ج: تذکرہ نگار اور مورخین میں سے اکثر مستند لوگوں نے اسے ظہوری ہی کی بتایا،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ دو صدیوں میں یہ اختلاف برابر ایک نسل سے دوسری نسل تک اور ایک دور سے دوسرے دور کے مصنفین تک گویا ایک "محترم امانت" کے طور پر منتقل ہوتا چلا آیا اگر کسی ایک مطبع والے نے اگر میر واضح کو پہلے مصنف لکھدیا، تو پھر کیا مجال تھی دوسرے مطبع والوں کی کہ اس سے ذرا بھی انحراف کر سکتے، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پر لطف اور تعجب خیز بات وہ ہے، جسے اہلِ مطبع کے بارہ میں ڈاکٹر محمد احمد نے لکھا ہے :-

"اس کے علاوہ ان (مطابع) کے عملہ کا یہ کارنامہ بھی لائق دید اور قابلِ داد ہے کہ انھوں نے خاتمۃ الطبع میں اپنے حواشی کا مستند ہونا ظاہر کرنے کے لئے "بہارِ عجم" وغیرہ کا ذکر کر دیا اور ماخذ بنالیا، مگر یہ نہ دیکھا کہ بہارِ عجم کے مصنف نے اس کتاب کو کس کی تصنیف بتایا ہے؟ صاحبِ بہارِ عجم نے تو مبہم الفاظ میں لغات و محاورات کی سند میں نور الدین ظہوری کا نام لکھا ہے، اور یہ اہلِ مطابع بہارِ عجم کا حوالہ بھی دیتے ہیں، پھر بھی مصنف بتاتے ہیں میر واضح کو"

(مقدمہ مینا بازار ص ۱۱)

یہ تو اہلِ مطابع کا حال تھا، رہے تذکرہ نگار تو اگرچہ افواہِ عام کی تحقیق کرنا، سنین و شہور کے اختلاف کو دور کرنا اور خارجی و داخلی قرائن و دلائل سے تعیینِ مصنف و دیگر مشتبہات کا محقق و متعین کرنا، انہی کا منصب تھا، لیکن اگر آپ تذکروں کو اٹھا کر دیکھئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اکثر اس قسم کی بحثیں چھیڑتے ہی نہیں، مینا بازار کے مصنف کی تعیین ہی کا مسئلہ لے لیجئے، بعض تذکروں کے مختصر اور مبہم بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ مسئلہ یا تو ان کے زمانہ میں اٹھا ہی نہیں، اور یا ان کے نزدیک قابلِ توجہ نہ تھا، مگر اس سلسلہ میں پروفیسر محمد حسین آزاد نے جو موقف اختیار کیا ہے، وہ تعجب خیز بھی ہے، اور تمسخر انگیز بھی، وہ سخندانِ فارس اور نگارستانِ فارس

دونوں میں زبان کی عہد بعہد تبدیلی و ترقی کا ذکر کرتے جا رہے تھے کہ مینا بازار کا بھی ذکر آگیا، وہاں اس کتاب کے مصنف کی بحث چھیڑنے کا نہ موقع تھا، اور نہ آزاد کو اس کے مصنف کا تذکرہ لکھنا مقصود تھا، کیونکہ میری رائے ناقص میں آزاد کی یہ دونوں کتابیں تذکرہ سے زیادہ تاریخ ادب کے موضوع پر ہیں، لیکن پھر بھی ایک چلتا ہوا فقرہ اس کے مصنف کے بارہ میں بھی لکھ گئے، اس کے متعلق ڈاکٹر محمد احمد نے لکھا ہے، اور ٹھیک لکھا ہے، اور بہت خوبی سے لکھا ہے کہ:

"آزاد کی عام عادت ہے کہ سُنی سنائی بات کو اور اکثر اپنے قیاس اور اٹکل کو بڑے ہی آب و تاب سے لکھ مارتے ہیں، کبھی وہ اپنی ایک سنی بات کو "اہل راز" "یا اہل تحقیق" جیسے مجہول انکال راویوں کی زبان سے کہلواتے ہیں، اور پھر خود ہی اس پر سب سے پہلے ایمان لانے والے بن جاتے ہیں،" (ص ۱۱ حاشیہ)

لیکن میری سمجھ میں نہ آسکا کہ جب ڈاکٹر محمد احمد پروفیسر آزاد کی سطحیت کو پہچان گئے تھے تو پھر انھوں نے اس کی تحریر کی طرف اعتنا ہی کیوں کی ؟ اس بیچارے نے تذکرہ مصنفین لکھا کب ہے کہ اس کو تذکرہ نگاروں میں شمار کیا جاسکے ؟ پھر ایسی سطحی بات کہ "کوئی کہتا ہے واضح کی ہے، کوئی کہتا ہے ظہوری کی، یا "ناواقف لوگ مشہور کرتے ہیں کہ ظہوری کا ہے، مگر اہل تحقیق سے سُنا گیا ہے کہ ارادت خان کا ہے" تو "تائیدًا یا تردیدًا سند میں پیش کرنے کے قابل ہی نہ تھی ؟ میری رائے میں تو اس بارہ میں ڈاکٹر نذیر صاحب نے بھی غلطی کی کہ اس کو تذکرہ نگار قرار دیا اور مستند سمجھا، اور اپنی تائید میں اُسے پیش کر رہے ہیں، اور ڈاکٹر محمد احمد نے بھی غلطی کی کہ تردید ہی کے لئے سہی مگر اس کی طرف اعتنا کی، انھوں نے تو کم لکھا آزاد کا حال سُننا ہو تو علما سے محققین سے سنیئے، آزاد کی تحریر میں لسانی اور لفاظی، استعارے اور کنایے سبھی کچھ ہیں اگر نہیں ہے تو بس تحقیق، وہ ہر چیز کو انشا، اور لسانی کے بل پر حل کرنا چاہتے ہیں، مکاتیب آزاد مرتبہ طاہر (نبیرۂ آزاد) میں ایک خط میں لکھا ہے کہ آب حیات کا کام جو دس ماہ میں ہونا چاہیئے تھا، میں نے دس دن میں کیا، آزاد سے بھلا کوئی پوچھے کہ کیوں صاحب "وہ اہل تحقیق" آخر کون بزرگ ہیں ؟ اور سُنا گیا ہے آخر کون قابل اعتماد طرز بیان ہے ؟ اور صاحب بہار عجم مولانا صہبائی

کو تو آپ بھی جانتے ہوں گے، یہ لوگ آخر "ناواقف لوگ" کب سے ہوگئے ؟ اور "مشہور کرتے ہیں" کی بدگمانی و بدگوئی آخر آپ کس قرینے کے سبب سے اُن پر کر رہے ہیں ؟ کچھ نہیں نہ کسی بات کا سر نہ پیر، بس لکھ مارنا مقصد، اور لکھا بھی ہے تو عجیب پنجابی نما اردو میں کہ ایک جگہ اسی مینا بازار کو مؤنث لکھتے ہیں: "کوئی کہتا ہے واضح کی ہے" اور دوسری جگہ مذکر کہ "ظہوری کا ہے" اور "ارادت خان کا ہے"، اور لوگ ہیں کہ اس اردو پر خوش ہیں: مینا بازار پورا ایک مستقل لفظ ہی اور ایک کتاب کا عَلم بن گیا ہے، اس کے لئے جب ضمیر یا صفت آئے گی تو کتاب کے لحاظ سے آئے گی، بازار کے لحاظ سے نہیں کوئی یوں نہیں کہتا کہ آزاد کا آبحیات جب نکلا شبلی کا شعر العجم اچھا ہے، وغیرہ، خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں کہہ یہ رہا تھا کہ ناشرین، اور تذکرہ نگاروں کا تو یہ حال تھا،

اب رہے ارباب فرہنگ و لغات دشارحین تو میرے خیال میں آج تمام علمی دنیا کے علم و عمل کا مدار اسی پر ہے کہ مستند اہل لغت کی تحقیق اور تحریر کو حرف آخر مانتے ہیں، انہی کا منصب تحقیق ہے، وہی ماہرین سخن ہوتے ہیں اور وہ سند میں اشعار یا فقرات مختلف مصنفین کے لکھتے رہتے ہیں اگر یہی وہ غلطی کریں تو پھر ادب جیسے نقلی علم سے امان و اطمینان ہی اٹھ جائے، اور مسرت کا مقام ہے کہ لائق ڈاکٹر محمد احمد نے اس مبحث میں اسی ماخذ کو مستند پایا، اور مستند بتایا، اور ان محققین کے اعتماد پر مینا بازار کے مصنف کی تعیین کی بحث اپنے مقدمہ میں چھیڑی تو نہایت اصولی اور معقولی انداز سے مکمل بحث بھی کی، اور عدل و نقل، نقد و نظر کی روشنی میں اس بحث کو ہمیشہ کے لئے صاف اور ختم کر دیا، اور متیقن طور پر بتلا دیا کہ اس کا مصنف ظہوری اور صرف ظہوری ہے، ظہوری ہی ہوسکتا ہے، ظہوری کے علاوہ دوسرا نہیں ہوسکتا، اس سلسلہ کی بعض عبارتیں ڈاکٹر محمد احمد کے مقدمہ سے نقل کر دینا غالبًا بے موقع نہ ہوگا،

۱- (الف) تین مخطوطات خاموش ہیں، (وہ اُس کے ظہوری کی تصنیف ہونے کی اگر تائید نہیں کرتے، تو تردید بھی نہیں کرتے)، اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ دو مصنفین اور تین اہل مطبع نے تو مینا بازار کو میر واضح کی تصنیف لکھا ہے اور دس مصنفین اور چار مخطوطات نے ظہوری کی تصنیف بتایا ہے پھر میر واضح کے طرفدار جو دو مصنفین،"

(آزاد اور ولیم بیل) ہیں، اُن میں سے آزاد صرف "سُنا گیا ہے" کے لفظ سے اپنے قول اور رائے کا اظہار کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ افعال مجہول الفاعل یقین و جزم کا فائدہ نہیں دیتے،

البتہ ظہوری کے طرفدار جو نو مصنفین ہیں، ان میں ملا غیاث، مولانا صہبائی، "نیرنگِ بہار، ملا شاد جیسے محققین لغات اور استادانِ زبان جزم و یقین کے ساتھ ظہوری اور صرف ظہوری کا نام لیتے ہیں" (ص)

ب: ملا احمد علی نے چونکہ یوں لکھا ہے کہ

"مینا بازار ظہوری جو بہت مشہور ہے کچھ لوگ اسے واضح کی بتاتے ہیں، اس لئے وہ بھی ظہوری کا طرفدار ہے نہ کہ واضح کا" (ص ۱۱)

میرے نزدیک بالکل ظاہر ہے کہ احمد علی کا مینا بازار کی اضافت ظہوری کی طرف کرنا اس کی بین دلیل ہے کہ خود انکے نزدیک مصنف مینا بازار ظہوری ہے، اور وہ گویند کہہ کر عوام کا خیال ظاہر کر رہے ہیں،

احمد علی صاحب کے اس صاف قول کا جس کے واضح معنی ڈاکٹر محمد احمد بتا بھی چکے ہیں، نہ معلوم کس طرح سے ڈاکٹر نذیر صاحب یہ مطلب نکالتے ہیں کہ

"عام طور پر ظہوری کی طرف منسوب ہے لیکن ارادت خان کی معلوم ہوتی ہے"،

ج: "لطف یہ کہ واضح کی دو تصانیف ہیں، ان میں ایک بھی ادب میں نہیں، اور ان دونوں کی طرز نگارش محض سادہ ہے، اور مینا بازار سے بالکل مختلف ہے (ص ۱۲ ملخصاً)"

میرے نزدیک یہ داخلی شہادت ہے اور نہایت قوی، کیونکہ میر واضح اگر ایسی رنگین اور بلند عبارت لکھ سکتے تو واقعی سخت حیرت ہے کہ اُن کی ایک تحریر بھی اس طرز کی حامل نہیں،

د: "اگر مینا بازار میر واضح کی تصنیف ہوتی، تو یہ بات ذرا مستبعد معلوم ہوتی ہے کہ بارہویں صدی اور تیرہویں صدی کے مصنفین اور محققین میر واضح کا نام اس کتاب کے سلسلہ میں تو بھول جاتے

جس کا زمانہ اُن سے قریب ہی تھا، اور کتاب کا مصنف ظہوری کو بتاتے جس کا زمانہ ایک سو سال پہلے تھا" (ص ۱۴)

ہ: "ذیل کی مثالوں سے موازنہ (سہ نثر و مینا بازار) کے کلام کے ساتھ ساتھ اس امر کے داخلی ثبوت کا کام بھی ہم لیں گے کہ مینا بازار ظہوری ہی کی تصنیف ہے" (ص ۲۲)

یہ سب بھی نہایت قوی ثبوت ہیں، کیونکہ داخلی شہادت، اور داخلی ثبوت زیادہ قابلِ اعتماد اور ناقابلِ تردید ہوا کرتا ہے،

و: چند جملے مینا بازار کے لکھ کر لکھتے ہیں:-

"غور سے پڑھئے یہ جملے کوئی صاحب طرز مشاق اور شہرۂ آفاق شخص ہی کہہ سکتا ہے جسے گمنام رہکر بھی اپنے قلم کی طنازی اور اپنے طرز کی غمازی پر پورا اطمینان ہے، اور نہایت وثوق سے کہتا ہو کہ آج نہیں تو کل میرا نام مشہور ہو کر رہے گا، حسنِ اتفاق کہ خوان خلیل میں خود لکھتا ہے "آفتاب بر تیغش پرتو عاطفت انداختہ خفائی را ظہوری ساختہ"

۲- لائق مقدمہ نگار (ڈاکٹر محمد احمد) نے "تیر باران" کی مثال میں میرے نزدیک ناقابلِ تردید طور پر ایک تو اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے کہ مینا بازار کا مصنف ظہوری اور صرف ظہوری ہے، دوسری طرف اپنی فارسی زبان کی مہارت اور پاکیزہ ذوق کا بھی اظہار کیا ہے،

اُن کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ سہ نثر مسلّم طور پر ظہوری کی ہے، اس میں اُس نے "تیر بارانِ فاقہ" کا لفظ لکھا ہے، یعنی فاقہ کے تیر برسے اور مینا بازار میں تیر بارانِ طعنہ ہے (طعنہ کے تیر برسے) اس سے اتنا ظاہر ہوا کہ اس کے مصنف کو بھی مثل ظہوری کے تیر باران کے صحیح استعمال کا سلیقہ ہے، اس نے اس سے اس رائے کو تقویت ہوتی ہے کہ مینا بازار کا مصنف بھی ظہوری ہی ہو، اور کسی حال میں بھی واضح نہیں ہو سکتا، اس قرینہ سے کہ انھوں نے ایک شعر میں "تیر بارش ناوک" کا لفظ لکھا ہے جس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اس بارش میں ناوک ہی

تیر بن کر برسا، یہ ایک بھونڈی سی بات ہے، اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ واضح ظہوری کے برابر باسلیقہ نہیں، پھر تیر باران ایک حسین و مروج ترکیب کو چھوڑ کر "تیر بارش" کہنا ایک تو روزمرہ و محاورہ میں تصرف کرنا ہے، جو ناجائز ہے، دوسرے "تیر بارش" کی ترکیب بھی کچھ "تیل مالش" کی طرح لغو سی بن کر رہ گئی ہے،

۳ - لیکن لائق مقدمہ نگار نے ظہوری کے مصنف ہونے کی تائید میں ایک اور قابلِ توجہ قیاس ادر نادر نکتہ بیان کیا ہے اور نہ معلوم کیوں اُسے بہت چھپا کر ص ۱۲۰ پر بسلسلہ شرح الفاظ لکھا ہے، میرے نزدیک تو اُسے بھی مقدمہ ہی میں لکھنا چاہئے تھا،

متن مینا بازار کے خاتمہ پر (ص ۵۴ پر) یہ جملہ بھی ہے :-

"در اتفاق یک دگر از خامۂ شگرف کار اعجوبہ نگار اندیشہ بجبر دلخواہ دو رقم نقوشِ اوصاف این عشرہ کاملہ بر صحیفۂ قدر و جلال بستند"

اس کی شرح کے ذیل میں لکھتے ہیں :-

"نکتہ جلال کا لفظ اگرچہ قدر کا معطوف اور مرادف استعمال ہوا ہے، مگر مصنف نے جس شدت رازداری سے اپنا نام اور بادشاہ وقت کا نام چھپایا ہے، اُس سے تو جی چاہتا ہے کہ کسی بعید احتمال ہی سے کچھ پتا لگایا جائے، چنانچہ اس لفظ "صحیفۂ جلال" سے جلال الدین محمد اکبر کے زنانہ بازار کی تعریف کی فرمایش میں خط کا اشارہ بھی نکالا جا سکتا ہے، "دلخواہ" میں بھی شبہہ ہوتا ہے کہ اپنی نہیں اور کسی کے دل کی خواہش پر یہ کتاب لکھی گئی ہے"۔

واقعی یہ بات بہت قرینہ کی، بہت برمحل اور بہت لگتی ہوئی ہے، میرے نزدیک مینا بازار میں جو ظہوری نے اپنا نام نہیں دیا، تو شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ظہوری اس زنانہ بازار کو نوعیت اور اس کی تعریف کرنے کو اپنی روش آزادہ روی کے دامن پر ایک داغ سمجھتا رہا ہو اس لیے اس نے زنانہ بازار کی عورتوں کو تو تحریر لکھ کر بے پردہ کر دیا، مگر اُن کا پردہ اپنے نام پر ڈال لیا کہ پردۂ خفا ہی میں رہا لطف

یہ کہ اس کا تخلص ایک زمانہ میں خفائی تھا بھی، مگر اسے کیا کیجئے کہ پردہ ہلکا تھا، اور دیکھنے والوں میں مولٰنا صہبائی اور ڈاکٹر محمد احمد جیسے تیز نظر اور دیدہ ور دون نے آخر دیکھ ہی لیا، اور پہچان ہی گئے،

پھول کے لینے سے رندوں کی غرض ہو بوئے گل　　آپ کو دیکھیں گے ہم "گو آپ پردہ کیجئے"،

(احقر مراج)

یہ اقتباسات اگرچہ ذرا طویل ہو گئے، لیکن ان سے ناظرین کو اس امر کا اندازہ بھی اچھی طرح ہو گیا ہو گا کہ ڈاکٹر محمد احمد نے کس نکتہ رسی، خوبصورتی، کس دقیقہ سنجی، کس عرق ریزی اور کس سنجیدگی سے تعیین مصنف کی بحث کی ہے، اور کس قدر خوبی و لیاقت سے اس صدیوں کے اختلاف اور کم نظری کو یکسر رفع کر دیا، اور ظہوری کا مصنف ہونا متعین و متیقن کر کے میر واضح کے مصنف ہونے کی افواہ کی مکمل اور مفصل تردید کر دی، (اس کے متعلق ڈاکٹر محمد احمد نے معارف کی اشاعت مئی میں ایک سنجیدہ مضمون بھی لکھا ہے، جو قابلِ دید ہے)

مقدمہ مینا بازار میں تعیین مصنف ہی کی بحث لائق مقدمہ نگار کی اپنی بحث ہے، اور اسی کے باعث وہ مقدمہ قابلِ قدر بن گیا ہے، اور مانا جاتا رہے گا، اور میرے لئے فخر کی بات یہ ہے کہ میری اس تائید اور تحسین میں ڈاکٹر زبید احمد صاحب سابق پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد بھی حرف بحرف متفق ہیں، مقدمہ میں کوئی دوسری بحث انھوں نے کی، اور نہ اُس کی کوئی اہمیت ہے، ظہوری کے حالات کی جزئی تفصیلات سنین و مقامات کو انھوں نے دوسرے مصنفین کے بیان سے نقل کر دیا ہے کہ ان امور میں زیادہ تحقیق اور تفحص ایک تفتیش اور مقالۂ فضیلت نگار کے پیش نظر تو رہتی ہے، مگر جس شخص کو اس طرف خاص اعتنا کرنا نہ ہو وہ کسی ماخذ پر اعتماد کر کے اس کا قول نقل کر دیا کرتا ہے، ایسا ہی ڈاکٹر محمد احمد نے بھی بقیہ حالات کے ذکر میں ..... کیا جو پوری ۱۲۲ صفحات کی کتاب میں ایک ورق سے زیادہ نہیں ہے،

ڈاکٹر محمد احمد کو مقدمۂ مینا بازار پر ڈاکٹر نذیر کا تعقب و تعرض دیکھ کر مجھے بے ساختہ مولٰنا شبلی مرحوم کی شعر العجم پر حافظ محمود شیرانی کا تعقب و تبصرہ یاد آ گیا کہ اس تبصرہ کے بعد بھی شعر العجم، شعر العجم رہی اور اسی طرح

مقبول و متداول و مستند اور مشہور رہی اور حافظ صاحب کے نقد و تبصرہ کو سوا مورخ کے اب شاید کوئی جانتا بھی نہیں، بات یہ ہے کہ کوئی تصنیف محض تاریخ سنین و شہور کے بل بوتے ہی پر زندگی نہیں پایا کرتی، زندگی دینے والی چیز، نیک نیتی اور مصنف کا قلم ہے، اگر یہ چیزیں ہیں تو نقد و تبصرہ کہانی بن جاتا ہے اور کتاب باقی رہتی ہے، لیکن ہاں اگر یہی چیزیں تصنیف سے مفقود ہیں، تو محض تقریظ اور ریویو اشتہار اور پروپگنڈہ کی بیساکھیاں بھی اسے قائم نہیں رکھ سکتیں،

بہرحال میرے خیال میں ڈاکٹر محمد احمد نے مینا بازار جیسی بلند پایہ ادبی تصنیف کو ضروری مقدمہ اور خود کفیل شرح سے مزین کر کے فارسی زبان کی ایک بڑی خدمت کی ہے، اور کم علم اشخاص اور طلبہ پر ایک گونہ احسان کیا ہے کہ ایسی دشوار کتاب کو نہ صرف حل لغات و ترجمہ سے اسکو آسان بنا دیا، بلکہ جا بجا اس کے محاسن اور صنائع کی توضیح بھی کرتے گئے ہیں اکثر مقامات کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حل مشکلات بہت باوثوق ہے، میرے نزدیک یہ علمی خدمت خود ڈاکٹر محمد احمد کے لئے ایک قابلِ فخر کارنامہ اور طلبہ کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے یوں تو ہر کتاب کے ساتھ غلط نامہ (یا صحت نامہ) کچھ جزو لاینفک ہی سا ہو گیا ہے، لیکن ڈاکٹر محمد احمد کی افتاد طبع سے جو واقف ہوگا، اس کے لئے یہ چیز ذرا بھی تعجب خیز نہیں،

آخر میں مقدمہ میں تین چار مواقع کے متعلق ڈاکٹر نذیر صاحب کی تحریر پر جو استعجاب ہوا اس کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں،

(الف) ڈاکٹر محمد احمد نے مقدمہ کے ص ۱۶ پر لکھا ہے کہ ظہوری نے ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں ہو کر "دل ہی میں نظر گذران دیا" ڈاکٹر نذیر صاحب نے اس کی پرزور تردید کی ہے، خیر ان کے پاس اس کے جو دلائل ہوں اور جس قوت کے بھی ہوں اس کو تو وہ خود جانیں یا دوسرے زیادہ قابلیت والے لوگ جان سکتے ہیں، ہم کم علموں اور قدیم اسکول والے لوگوں کے علم میں تو واقعی یہی بات تھی کہ ظہوری بھی ابراہیم عادل شاہ پر عاشق تھا، اور اکیلے ہم اور ڈاکٹر محمد احمد ہی اس جرم کے مرتکب نہیں، مولینا الطاف حسین

حالی مرحوم بھی اس کے مجرم رہ چکے ہیں، انھوں نے اپنی زندۂ جاوید تصنیف یادگار غالب میں لکھا ہے:-

خواجہ حافظ کہتے ہیں:-

از عدالت نہ بود، دور گرش پرسد حال
بادشاہے کہ بہ ہمسایہ گدائے دارد

ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادہ خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں جو کہ اس کا ممدوح بھی ہے اور محبوب بھی ایک نئے انداز سے بندھا ہے وہ کہتا ہے،

مروت کردہ شبہا بر تو سیر بام و در لازم
نمی باشد چراغے، خانۂ بے دستگاہان را
(ص ۱۴۸)

ہم جیسے لوگ جو ڈاکٹر تو کیا کمپونڈر بھی نہیں، مولانا حالی، مولانا صہبائی وغیرہم کو استاد اور محقق ہی مانتے ہیں، اور مانتے رہیں گے، ہمارا تو منہ نہیں کہ اُن کی تغلیط و تکذیب کریں، یہاں خود مولانا حالی ہی کا ایک شعر لکھ دینے کو جی چاہتا ہے،

گرچہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے، کاش ہوتے ایسے ہی دنیا میں اک دو چار ہیچ!

(ب) ظہوری اور ابراہیم عادل شاہ دونوں کے مذہبی خیال کے متعلق مجھے بھی علم و یقین ہے کہ وہ اثنا عشری تھے ڈاکٹر نذیر صاحب کی تاریخی تحریر میری سمجھ میں نہ آسکی، اور اپنی اس کم فہمی کے اظہار میں مجھے کچھ جھجھک بھی محسوس نہیں ہوتی،

خاتمۂ تحریر میں بعض اساتذہ و ناقدین حال، ڈاکٹر اور پی ایچ ڈی حضرات کی رائیں بھی درج کئے دیتا ہوں جو احقر کی رائے متعلق کتاب مینا بازار سے متفق ہیں، بعض نے تعیین مصنف کی بحث کی تصریح بھی کر دی، بقیہ نے کتاب کی دیگر خوبیوں کا ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ کتاب سراپا عیب اگر کسی کے نزدیک ہے تو دوسروں کے نزدیک اس میں محاسن بھی ہیں؛

۱- ڈاکٹر زبید احمد صاحب ایم اے پی ایچ ڈی "..... (لائق مصنف نے) پورے یقین و صحت

سابق پروفیسر و صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی، — کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اس کتاب کے مصنف کی تعیین کے جھگڑے کا فیصلہ کر دیا، اور ظہوری کا مصنف ہونا اس طرح ثابت کر دیا، کہ اب کسی شبہ کی گنجایش نہیں رہ گئی،......"

۲- ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی، سابق پروفیسر و صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی

"......آپ نے نہایت کامیابی کے ساتھ تعیین مصنف کی بحث کی ہے، اور نہایت محکم طور پر یہ ثابت کر دیا کہ یہ کتاب ظہوری کی تصنیف ہے نہ کہ واضح کی،

۳- ڈاکٹر وحید مرزا صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، سابق پروفیسر و صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی،

(انتباہ: واضح ہو کہ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے باوجودیکہ ڈاکٹر نذیر صاحب کے خیالات و دلائل سے واقف بھی تھے، اور اپنے رفیق کار کے خلاف بھی نہیں لکھ سکتے تھے، پھر بھی یہ الفاظ لکھے ہیں) — "محمد احمد صاحب کے تعیین مصنف مینا بازار کی کوشش کے سلسلہ میں یہ تو مجھے کہنا ہی پڑے گا کہ ان کے دلائل نہایت پرزور، یقین آفرین اور خوشنما ہیں، اگرچہ ان کو فیصلہ کن نہ کہا جا سکے، متن کتاب نہایت فاضلانہ طریق اور احتیاط سے مرتب کی گئی ہے، اور تشریحی حواشی نہایت درجہ مفید ہیں،

۴- ایم ایچ صاحب موسوی صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی

"میرے نزدیک......یہ داخلی ثبوت ڈاکٹر محمد احمد صدیقی کے اس قول کے لئے نہایت کافی مؤید ہیں، کہ مینا بازار ظہوری کی ہے نہ کہ ارادت خان کی،

۵- سید ابو الحسن صاحب صدر شعبۂ عربی و فارسی بنارس یونیورسٹی،

"......اس میں شک نہیں کہ آپ نے کدوکاوش کرکے بہترین کارنامہ پیش کیا ہے، جو واقعی مفید ہے،

۶- پروفیسر زبیر صاحب صدیقی صدر شعبۂ عربی کلکتہ یونیورسٹی

"......اس کی تصحیح و تحشیہ کر کے اپنے طلبہ کا کام آسان کر دیا ہے، اور اس کے مقدمہ میں جن مسائل پر آپ نے بحث کی ہے، اس نے ادبی و تاریخی مباحث پر آپ کے تنقیدی مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے،......اور آپ کے ادبی و تاریخی ذوق کی داد تو ہر شخص کو دینا ہی پڑے گی

۷- ڈاکٹر اقبال صاحب صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی،

آپ نے نہایت فاضلانہ طریقہ سے مینا بازار کو مرتب کیا ہے، جس پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، آپ نے اسے مرتب فرما کر فارسی کی بڑی خدمت کی ہے،

۸- پروفیسر عبدالقدوس صاحب صدر شعبۂ عربی پٹنہ یونیورسٹی،

مصنف کے نام کے اختلاف.........اور مینا بازار کی اہمیت اور تاریخی حیثیت متعین کرنے میں مؤلف کی محنت، ذہانت اور درایت قابل تحسین ہے،

۹- شبیر احمد خان صاحب غوری ایم اے، مسجل امتحانات عربی و فارسی یوپی،

"مصنف مینا بازار کے معین کرنے میں مولانا (یعنی ڈاکٹر محمد احمد) نے جو کاوش فرمائی ہے، اس کی داد نہ دینا بیداد ہے، خارجی شہادتوں کے ساتھ......انھوں نے جو داخلی شہادتیں فراہم کی ہیں، ان شہادتوں نے مولانا کی رائے کو بہت زیادہ وقیع بنا دیا ہے اور جب تک اسکے مخالف دلائل اتنے ہی وزنی نہ ہوں، محمد احمد صاحب ہی کی رائے اس باب میں حرف آخر سمجھی جائے گی،

۱۰ - پروفیسر عبدالقادر صاحب
سروری عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

"آپ نے ان (دونون کتابون) کی ترتیب مین جس محنت، سلیقے اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے، وہ نہایت قابلِ قدر ہے، مجھے توقع ہے کہ ہندوستان کی ساری یونیورسٹیان مینا بازار کو فارسی کے نصاب مین شامل کر لین گی،

۱۱ - پروفیسر امرناتھ جھا صاحب
ممبر پبلک سروس بہار،

"مین بہت متاثر ہوا کہ آپ نے سنجیدہ طرز سے اور نہایت مستحکم طریق پر یہ ثابت کر دیا کہ مینا بازار ظہوری کی تصنیف ہے نکہ واضح کی،

واقعی سچ کہا ہے کسی نے کہ

ع ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہین جسے

شعرالعجم حصہ سوم

شعرائے متاخرین کا تذکرہ (فغانی سے ابوطالب کلیم تک) مع تنقیدِ کلام، قیمت :- للعہ

نوائے حیات

جناب یحیٰی اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرینِ معارف اور دوسرے اصحابِ ذوق پوری طرح واقف ہین، وہ دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع، اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے قلمِ فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

قیمت :- مجلد للعہ غیر مجلد ہے

"منیجر"

فیضی کا شاہکار

"نلدمن"

از

جناب سید رغیب حسین صاحب ایم اے، ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی

یہ مثنوی فیضی کا شاہکار مانی گئی ہے عشق و محبت کا یہ ایک جگر گداز قصہ ہے جس کو ملک الشعراء فیضی نے خسرو کی لیلیٰ مجنون کی بحر مین نظم کیا ہے، اس مین چار ہزار دو سو اشعار ہین، لاجواب تشبیہین، نازک استعارے، زبان کی شوخی، پرگوئی، بیان کی دلکشی، سب نے مل کر اس کے لئے ایک ایسی جگہ پیدا کر دی ہے جس کا ثانی سوائے خسرو کے کلام کے ملنا محال ہے، مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کا یہ مقولہ بجا ہے کہ فیضی کو فارسی اور سنسکرت ہر دو زبانون پر دسترس اور ان زبانون کی طرز ادا سے پوری واقفیت تھی، اس لئے وہ ایسے عظیم الشان علمی کارنامے کی تکمیل پر کامیاب ہوا، مگر ہماری حیرت اور استعجاب کی انتہا نہین رہتی جب ہماری نظر والہ داغستانی کے اس معاندانہ خیال پر پڑتی ہے کہ وہ فیضی کے شاعرانہ کلام کو خواجہ حسین ثنائی مشہدی کے اثر سے منسوب کرتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے،

"الحق چاشنی و عذوبتے کہ در کلام شیخ فیضی یافتہ شود، از فیض اثر صحبت خواجہ حسین ثنائی است"

ہر شخص جو شعر و شاعری کے بارہ مین ایرانیون کی تنگ نظری سے آگاہ ہے اُسے معلوم ہے کہ اُنھین ہندی نژاد شعراء کے کلام کی تحسین ناگوارِ خاطر ہوتی ہے، اور اگر طوعاً و کرہاً تحسین کرنا ہی پڑے تو وہ قومی

تفوق اور تعصب کی رو مین بہ جاتے ہین اور ہندی شعراء کے جوہر کو فارسی اثر سے منسوب کر دیتے ہین، اس کے برعکس فیضی کے کمالِ شاعری کے بارہ مین احمد رازی کی راے بڑی وزندار اور قابلِ ستائش ہے وہ لکھتا ہے:

"فیضی عربیت و حکمت را بیشتر تتبع نمودہ و در انشاء و مکارم اخلاق و انبساط طبع خود بے ہمتا است"

اختلافِ عقیدہ کے لحاظ سے ملا عبد القادر بدایونی فیضی کے زبردست حریف ہین اور بہت ہی درشت اور کریہہ الفاظ مین اس کا ذکر کرتے ہین، مگر جہان اسکی علمی قابلیت کا سوال آتا ہے وہ نہایت فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہین کہ مثنوی "نلدمن" ایسی نظم ہے کہ

"الحق مثنوی است کہ درین سہ صد سال مثل آن بعد از خسرو شاید در ہند کسے دیگر نگفتہ باشد" (بدایونی جلد ۳ ص ۲۹۶)

ایک اور جگہ ملا صاحب فیضی کا تذکرہ ان الفاظ مین کرتے ہین :-

"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشاء عدیل در روزگار نداشت" (بدایونی ج اول ص ۴۰۶)

علی نقی کمرہ نے جو شاہ عباس اول کے عہد مین دربار ایران کا مشہور شاعر اور ملک الشعراء تھا، ایک قصیدہ فیضی کی مدح مین ایران سے لکھ کر بھیجا، اس کے چند اشعار یہ ہین :-

مرا نگند بہ نظم امو دم بہ تو فیضی — ابوالفیض آن گزین اکبر و شیخ و کبیر من

اگر ہستم مجیر اندر سخن او ہست خاقانی — و گر من ستجیر آستان او مجیر من

کیم با او رسد در شاعری دعوائے ہم چشمی — کہ درین خانقاہ من مرید او دست پیر من

میرزا صائب ملک الشعراء دربار شاہ عباس ثانی فیضی کو "شیرین کلام" سے خطاب کرتا ہے، اور اس کی طرح مین غزل کہہ کر مقطع مین کہتا ہے:

این آن غزل کہ فیضی شیرین کلام گفت — در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ

زہمی قلندر ایران کا ایک اور مشہور شاعر خانخانان کی مدح مین قصیدہ کہتا ہے تو لکھتا ہے :-

زفیض نام تو فیضی گرفت چون خسرو — بہ تیغ ہندی اقلیم سبعہ را یکسر

مصنف "ماثر الامراء" اس کی قابلیت کے متعلق یون رطراز ہے :-

"بہ قوت طبع و جودت ذہن از جمیع علوم بخش وافر برداشتہ در حکمت و عربیت بیشتر تتبع نمودہ و شیرینی دانش از اندیشہ گرفتہ رنجوران تہی دست را چارہ می کرد" (ماثر الامراء جلد دوم ص ۵۸۹)

ڈاکٹر رضا زادہ شفق فیضی کے بارے مین اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظون مین کرتے ہین :-

"گرچہ فیضی در ہندوستان نشست و زندگانی کردہ است ولے در سلاست سخن و متانت و استحکام شعر بمقامے رسیدہ کہ او را از شعراء ایران بآسانی نتوان تمیز داد، و نفوذ او در ہند و عثمانی بسیار بودہ است"

فیضی کے ہمعصر ایرانی شعراء اور شعراے متاخرین کی ان آراء سے ناظرین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ فیضی کی شاعری کس بلند مرتبہ پر ہے، اور حق یہ ہے کہ اسکی داد اہل زبان ہی دے سکتا ہے، اگرچہ اس خداے سخن کو "شیرین کلام" کے خطاب سے آگے کسی نے نہین بڑھایا، یا بقول رضا زادہ :-

"او را از شعراے ایران بآسانی نتوان تمیز داد و نفوذ او در ہند و عثمانی بسیار بودہ است"

یعنی فیضی کو زبان فارسی پر اتنی قدرت ہے کہ ایرانیون کی زبان سے مشکل تمیز ہو سکتی ہے، ہندوستان اور سلطنتِ عثمانیہ مین اس کی قدر ہے اسی کو کہتے ہین "الفضل ما شہدت بہ الاعداء" مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا بیان کی تشریح نل دمن کے اشعار سے کی جائے، ہم اسکو کئی عنوانون مین تقسیم کرتے ہین،

نفس مضمون کی ترتیب | جس حکایت کو فیضی نے اپنی مثنوی کے لئے انتخاب کیا، وہ ہندی الاصل ہے مگر اس نے اس کا ایسا چربہ اتارا ہے کہ اصل سے سر مو فرق نہین، جو اس کے کمالِ شاعری کی دلیل ہے، اگرچہ اس مین

کچھ سقم بھی پائے جاتے ہیں، اگرچہ وہ چندان لائق توجہ نہیں ہیں، کیونکہ وہ اصل پلاٹ میں ہیں، نہ کہ نظم میں اور اس سے فیضی کی شاعری پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی، اس کا انداز بیان اس کی شاعری کے عناصر میں گھل مل کر ایک اچھوتی چیز پیدا کر دیتا ہے، اُس کے انوکھے طرز ادا اور رفعت خیال نے حکایت کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے، چنانچہ یہ کتاب نزاکتِ بیان اور فصاحتِ کلام میں بے مثل ہے،

۹۹۱ھ میں جب اکبر نے اصرار کیا کہ خمسہ کو پورا کرنا چاہئے، مگر یہ بھی حکم دیا کہ "نلدمن" کو مقدم رکھنا چاہئے، کیونکہ یہ اہل ہنود کا قصہ تھا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خدمات تھیں، اُن کی مشغولیتوں کے باوجود نلدمن چار مہینے میں تمام کی، اگرچہ اس کو ابتدا میں کچھ تامل تھا، جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے،

کین کار نہ زور بازویم بود
وین سنگ نہ ہم ترازویم بود

مگر آخر الامر یہ مثنوی خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوئی،

قصہ کا افتتاح اس طرح ہے کہ "دمینتی" اپنے (عاشق) "نل" کے خط کے جواب میں لکھتی ہے:-

من پردہ نشین و غم نشیمن — زندان بلاست خانۂ من
شاہی و دولت بہ این و آن بند — بر حدیث تخت عشق تا چند
تو بادہ نوش آشکارا — خونابہ بہ عاشقان گوارا

اس طرز سے قطع نظر جو صنفِ نازک کا خاص وصف ہے، مذکورۂ بالا اشعار کی خوبی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا، نقاد اعتراف کریں گے کہ ایک خاتون کی زبان سے اس صفائی کے ساتھ اظہار عشق کچھ نامناسب سا معلوم ہوتا ہے، مگر انھیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ "دمن" ایک ہندی نژاد شہزادی ہے اور ہندی شاعری میں عموماً عورت عاشق ہوتی ہے، تاہم جذبات کے اظہار میں نل نے پہل کی ہے، اور "دمن" نے جس سے بیان ہے کہ شاعر نے کس دانائی سے ایرانی اور ہندی خیالاتِ عشق

کا امتزاج کیا ہے،

کردار پوری حکایت میں دو افراد "نل" اور "دمن" امتیازی شکل لئے ہوئے ہیں، لیکن ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ "نل" نہیں بلکہ "دمن" داستان کی اہم کردار اور نسوانی ایثار کا نمونہ ہے، جو قصہ کی جان ہے، اور "نل" عشق حق کا نمایندہ ہے، "نل" ایک بعید الفہم طریقہ سے "دمن" پر عاشق ہو جاتا ہے، اور اس کا سوزِ عشق "دمن" کے دل میں بھی چبھن پیدا کر دیتا ہے، اس کے بعد سویمبر کی رسم ہوتی ہے، جس میں "نل" بھی مدعو کیا جاتا ہے، "دمن" کی نظر انتخاب "نل" پر پڑتی ہے، دونوں کا بیاہ ہو جاتا ہے، بعض ارواح خبیثہ کی تحریک پر "نل" قماربازی شروع کر دیتا ہے، اور انجام کار اپنی سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، وفا شعار شہزادی زمانۂ جلاوطنی میں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے، لیکن وہ اسے جنگل میں تنہا چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے، "دمن" کی فلک شگاف آہ و بکا ان اشعار میں ملاحظہ ہو:

بگشاد دمن زبان بہ پاسخ — کائے تافتہ از دغا فتم رخ
گر زہ بودم بروئے شمشیر — از مہر ہی تو کے شوم سیر
گر تو بگذاریم درین سوز — من چون بگذارمت درین روز
عشق است انیس روزگارم — با ما در با پدر چہ کارم
زین آرزوئے محال باز آئی — باز آے ازین خیال باز آ

دمن جب تنہا رہ جاتی ہے تو درد فراق میں کہتی ہے،

رفتی و مرا خبر نہ کردی — بر بیکسی ام نظر نہ کردی
افتادہ بر بستر ہلاکم — در خواب گذاشتی بخاکم
تو طرح وفا وداع کردی — عشق دگر اختراع کردی
تاثیر فسون عشق بردی — ناموس جنون عشق بردی

بہت سے مصائب جھیلنے کے بعد وہ اپنے والدین کے پاس پہنچتی ہے ، ادھر "نل" زندگی کے انقلاب سے گذرتا ہوا کسی بادشاہ کے دربار میں ملازمت اختیار کر لیتا ہے ، یہان "دمن" اس کی رہائی کا سبب بنتی ہے اور "نل" کو مشکلات سے نجات دلانے مین معین ہوتی ہے ،

پھر "نل" عیش و کامرانی کے چند سال گذارنے کے بعد دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے بلکہ "دمن" اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو جاتی ہے ، اور داستان کے واقعات پر لیل و نہار کا پردہ پڑ جاتا ہے ، اس حکایت مین از اول تا آخر بہ نسبت "نل" کے "دمن" کا کردار نہایت دانشمندانہ ، بلند اور دلپذیر ہے ،

خیالات کی بلند پروازی | متاخرین کی شاعری ، خیالات کی طوالت کے لئے مشہور ہے فیضی بھی ایک حد تک اس سے بری نہین ، اس کی مثنوی مین کثرت بلند خیالی کی ایسی مثالین پائی جاتی ہین ، جہان تک خلافت کی پہنچ بھی نہین ہو سکتی ، "نل دمن" کے افتتاحیہ مین کہتا ہے کہ " ذات باری تعالیٰ " کی حقیقت کو سمجھنا ناممکنات سے ہے ،

آتش زنم این بہار امید | تا میوہ طمع ندارد از بید
پروانہ خس و ہوا شرربار | پروانہ چہ گل کند درین کار
ہیہات چگونہ سر کشد کس | رہ بر دم تیغ و پائے از خس
ہم پاشنہ ریش و ہم کف آماس | چون پائے نہم بدشت الماس
توحید تو ہر کہ راند در قیل | بر مورچہ زد عماری فیل

پھر اپنے رسمی فضل و ہنر کی بے مائگی کے ذکر کے بعد صداقت کی جستجو مین دلیل و فکر کی نارسائی کا اس طرح ذکر کرتا ہے ،

تو بردہ بخط گمان نفعے | و آن خود ہمہ عقرب است و افعے
اے سادہ ز خط مباش غافل | کین مورچہ خورد جوہر دل

آئینہ ز نقش سادہ باید | کان سادہ عذار رو نماید

شاعر کے پرواز خیال کی دو مثالین اور نقل کی جاتی ہین ،

آن نقش کہ دانشش نمونہ | کمنش زدہ نعل واژگونہ

ہستی باری تعالیٰ کے متعلق ہمارا علم بالکل سطحی بلکہ سلبی ہے ، یعنی ہمین متناہی ہستیون کا کسی قدر علم ہے جس سے کچھ نہ کچھ نتائج اخذ کر لیتے ہین کہ وہ ذات باری کے مظہر ہین ، جو خود غیر متناہی ہستی ہے ، لیکن کیا ہم "غیر متناہی" کا ایجابی تصور کر سکتے ہین ؟ ہرگز نہین ، اس لئے شاعر اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ وسائل جو حقیقت الٰہیہ کے تصور کی تقویم مین معاونت کر سکتے ہین ، گمراہ کن ہین ، کیونکہ "متناہی" سے "غیر متناہی" کی تفہیم مین کوئی مدد نہین مل سکتی ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا حق تعالیٰ نے اس سراب کو عمداً پیدا کیا ہے ، تاکہ انسان وجود الٰہیہ کی دھار مین بھٹکتا پھرے ، یہان شاعر کی قوت متصورہ اس کو ایک قدیم تصور کی طرف لیجاتی ہے جس کے برتنے والے وہ جنگی مار ہوتے ہین جو اپنے گھوڑون کو الٹی نعلین لگوا کر اپنے تعاقب کرنے والون کو دھوکہ مین ڈالتے تھے ، اس سلسلہ کے خیالات کا فیضی نے نہایت خوبصورتی سے صرف ایک بیت مین خلاصہ کر دیا ہے ،

آن نقش کہ دانیش نمونہ | کمنش زدہ نعل واژگونہ

اس تمثیل کا مرادف عربی اور فارسی شاعری مین کہین اور نہ مل سکے گا ، اسی طرح وہ کہتا ہے کہ صفات الٰہیہ کا ایک مبہم تصور بھی ہمارے امکان سے باہر ہے ،

ذاتت صفت صفت گرفتہ | حیرت رہ معرفت گرفتہ

یہ اشعار گویا صوفیہ کے اس عقیدہ کی ترجمانی ہین کہ حق تعالیٰ کی "صفات" "عین ذات" ہین ،

تشبیہات و استعارے | فیضی کی شاعری استعارون کی شوخی اور تشبیہات کی ندرت سے معمور ہے ، اس کے لطیف استعارے ، رنگین تشبیہین ، بلند مضامین ، نازک خیالات ، فصیح زبان ، لفظون کی عمدہ ترشین ، دل کش ترکیبین اور ادائے مطلب کے انداز دیکھنے کے قابل ہین ، اور اس کی رنگین اور گہبار عبارت آرائی ضرب المثل بن گئی ہے ، "آن نقش اتخ"

اس کی اور مثالین ملاحظہ ہون،

بت خانۂ ہند چشم مستش   ہندی صنمان صنم پرستش

چشمش بہ نگاہ جادوانہ   صد بت کدہ را قمار خانہ

شمشیر گر نگاہ خونی   سوہان زن آتش درونی

در مستی نرگس سیاہش   صد میکدہ زیر ہر نگاہش

شاہنشہ غمزہ فوج در فوج   طوفان کرشمہ موج در موج

ہر موے چو رشتۂ فسونی   زنجیر بہ گردن جنونی

چشمش کہ چو فتنہ مست خفتہ   صد دشنہ در آستین نہفتہ

جوش بیان | عام خیال یہ ہے کہ فلسفی کبھی اچھا شاعر نہین ہوتا، کیونکہ فلسفہ اور جذبات مین تناقض ہے، مگر خیام اور فیضی اس کلیہ سے مستثنیٰ ہین، مولینا شبلی کا قول ہے کہ

"فیضی کی خصوصیات مین سب سے بڑھ کر جوش بیان ہے، جس کا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی، جوش بیان حافظ مین بھی ہے، اور اعلیٰ درجہ پر ہے لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے، فیضی کے یہان فخریہ، عشقیہ، فلسفیانہ، ہر قسم کے مضامین مین وہی جوش پایا جاتا ہے، جوش بیان اُس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے، جو کسی اور کو نصیب نہین ہو سکتا"[1]

فیضی انسانی جذبات کی جب تصویر کھینچتا ہے تو اس مین کوئی شک نہین کہ وہ بے انتہا دلکش اور حسین ہوتی ہے، ذیل مین چند مثالین نل دمن سے پیش کی جاتی ہین، "نل" جب اپنے مصاحبون سے "دمن" کا حال سنتا ہے تو اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کرتا ہے،

اے ہم نفس این چہ داستان بود   وین گرد کدام آستان بود

گر یک گرہ مرا کشودی   چندین گرہ دگر فزودی

[1] شعر العجم جلد سوم ص ۷۲،

بروی غم دل بلا کش من   آتش چہ زدی در آتش من

یاقوت ز دیدہ ام فشاندی   الماس بہ سینہ ام نشاندی

بر دیدہ در بلا کشادی   بر فتنہ صلاے عام دادی

دیکھئے "دمن" کی ماں اپنی بیٹی سے کس طرح رنج و غم کا سبب پوچھتی ہے، اور اُسے دلاسا دیتی ہے،

آن مادر مہربان کہ دانی   برخواند فسون مہربانی

کاے تازہ نہال نو بہاری   در سر و تو چیست بیقراری

افسردگیست بے تگرگت   بے آب چراست شاخ و برگت

دیدی بہ رہے اگر پری را   در کار کنم فسونگری را

در زد صنمے رہ تو در خواب   دانا ننہد مدار بر خواب

تو نکتہ شناس و ہوشمندی   بر خواب و خیال دل چہ بندی

گر چشم تو دید نو بہارے   در گوش تو پوشد از نگارے

گیرم بہ نگار تو بہارت   بندم ز نگار تو نگارت

جوش بیان، آزاد خیالی، اور وسیع النظری فیضی کو حافظ اور عرفی سے بھی بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے، مثلاً وہ یہ بتلاتا ہے کہ کس چیز نے اُسے اس مثنوی کے لکھنے پر مائل کیا،

یعنی کہ نقیب بارگاہی   آورد نوید پادشاہی

برخیز کہ یاد کرد بختت   شہ خواند بہ پایگاہ تختت

برخاستم از زمین فلک تاز   برخاستہ مو بمو بہ پرواز

پا از مژہ چون بہ رہ کشادم   بر ہر مژہ منتے نہادم

چشمے کہ بہ رہ گذار کردم   چشم دگرش نثار کردم

زین در بگذشتہ پیش رفتم　　　وانجا نفسے زخویش رفتم

بگذشتم ازان در ادب نیز　　　کو نین گذاشتہ بہ دہلیز

دیدم دو جہان بیک جہان در　　　صد عمر ابد بیک زمان در

غور کیجئے کہ اپنے قدر شناس اور مربی بادشاہ اور درباری مصاحبون کا کس انداز سے ذکر کرتا ہے، اس کی زندگی، اس کا مرتبہ، اسکی شہرت شاہنشاہ کی قدر افزائی کی مرہون منت تھی، پس انتہائی جوش عقیدت محبت اور تعظیم بھرے الفاظ سے اُسکو پڑتا ہے، اکبر سے خطاب مین بڑے فخریہ انداز مین اپنی علمی فضیلت کا ذکر کرتا ہے اور اس کا جوش بیان اور گرمی سخن اس وقت کمال اوج پر ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو تمام مخلوق سے برتر سمجھنے لگتا ہے،

امروز نہ شاعرم حکیمم　　　دانندۂ حادث وقدیمم

کلکم بہ نفا جزو کل بین　　　یک نخل بہ صد ہزار گل بین!

ہر موئے تنم ز پردۂ راز　　　تاریست جدا جدا نوا ساز

گفتم سخن و درین سخن نیست　　　کانجا کہ منم مقام من نیست

دریاب کہ از نظارۂ چند　　　بگداختہ ام ستارۂ چند

این رخت من است رخت کس نیست　　　نو بادہ ام از درخت کس نیست

این نخل کہ غنچہ اش کشادم　　　آب از عرق جبینش دادم

چون خود تو کنی بلند کوسم　　　من ہم در آسمان بکوسم

محاکات　فیضی کا محاکاتی کمال اپنے معاصرین سے کسی صورت مین بھی کم نہین ہے لیکن اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ متاخرین کی شاعری مین اس کی مثالین اس قدر کمزور اور سطحی ہین کہ دور حاضرہ مین محاکات کا جو تصور ہے، اُن سے اُن کی تطبیق نہین ہوتی، کیونکہ شاذ و نادر ہی وہ مناظر قدرت کا ہوبہو خاکہ کھینچ سکتے ہین،

اگر وہ اس کی کوشش بھی کرین تو یہ خاکہ بے معنی اور رسمی ہوتا ہے فیضی بھی اس سے مستثنیٰ نہین، اس کی مثنوی سے چند مثالین پیش کی جاتی ہین جن مین وہ صفات عشق بیان کرتا ہے،

دلہا ہمہ در نشیمن راز　　　بر یکدگر اند پر تو انداز

در دیدہ عاشق او فتد خار　　　نشتر شکند بپائے دلدار

این جوشش مہر در دو سینہ　　　یک مے بود و دو آبگینہ

یک نغمہ نشستہ در دو پردہ　　　یک نشہ دو جا ظہور کردہ

عاشق ستمے کہ دیدہ از عشق　　　معشوق بجان کشیدہ از عشق

عاشق جرسے کہ بر فغان بست　　　معشوق ہمان جرس بجان بست

دوسرے موقع پر کہتا ہے،

بر عقل ز عشق شد شبیخون　　　از صبر ز شوق برد جیحون

انگیخت ز عشق آتشین خوے　　　آتشکدہ بہ ہر بن موئے

صد دیدہ و دل بہ یکدگر بست　　　گلدستہ حسن و عشق بر بست

صد دل بہ شکنج طرہ دربست　　　بر شیر ز مو قلادہ بر بست

دیکھو کس خوبی سے فیضی "دمن" کے حسن دلآویز کا ذکر کرتا ہے،

در خاک دکن کہ فتنہ خیز است　　　امروز دکان فتنہ تیز است

جادو صنمے صنم فریبے　　　نگذاشتہ در جہان شکیبے

گل چہرہ سمن برے دمن نام　　　از موے فگندہ بر چمن دام

بتخانۂ ہند چشم مستش　　　ہندی مثنان صنم پرستش

صد برہمنش بخون نشستہ　　　در بتکدہ بت بہ بت شکستہ

آتش زنِ سومنات قہرش | زنار گسل بتان عمرش
چشمش بہ نگاہِ جادوانہ | صد بت کدہ را قمار خانہ
بر خندہ و نمک برات کردہ | از سحر نمک نبات کردہ

مذکورۂ بالا بیان سے اس بیان کا مقابلہ کرو، جو اُس نے نل کے "مردانہ حُسن" کے بارے میں کیا ہے:-

حُسنے و بہار دلفریبے | عشقے و جہان ناشکیبے
سیمین بُت و بُت پرست ماہر | صد بُت کدہ زیرِ ہر نگاہے
بالا چو سنانِ آب دادہ | ابرو چو کمند تاب دادہ
در عشق فگندہ بو زمین رخت | در حسن زدہ بہ آسمان تخت
تیغ بمیانِ تار بستہ | صد دشنہ بروے دل شکستہ
یک تیغ گر از میان کشادہ | صد تیغ بدست غمزہ دادہ
با ابرو و چشم قصد جان را | شمشیر سپردہ ہندوان را

جدت طرازی

فیضی کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہین کہ اُسے فارسی زبان پر کس قدر قدرت حاصل ہے، فقرون کا دروبست، زورِ بیان، جدت طرازی اس کے مخصوص جوہر ہین، ایک ہی بات کو وہ سینکڑون طرح سے اور ہر بار نئے پیرایہ مین نہایت روانی اور طرفہ طریقہ سے ادا کر سکتا ہے جو اہلِ زبان کا خاصہ ہے، ذیل کے ابیات مین ایک ہی بات دو پیرایون مین اس نے ادا کی ہے، اس خوبی پر ذرا غور کیجیے،

آگہ نہ کہ گرد دامن کیست | وین غنچہ نہ خار گلشن کیست
در جیب گلش کہ این خسک ریخت | در زخم دلش کہ این نمک ریخت

آتش کہ بہ سقف خانہ در زد | وین فتنہ ز دامن کہ سر زد
این صبر و شکیب خستہ کیست | وین شیشہ بہ رو شکستہ کیست
این فتنہ بخون من کہ سر داد | وین داروے بیہشی کہ در داد
برقے بہ درون خانہ افتاد | کاتش بدل زمانہ افتاد
این شعلہ ز آب تشنہ کیست | وین دیدہ خشک تشنہ کیست

"بر موجہ عماری فیل زدن" "بر کوس لب دوال زدن" "ذرہ گل خیز" "اندیشہ زداے پیش بینان" "نظر گداز" "مژگان گسل" "جا بیک قدم بساط افلاک" "گرداب بین و موجِ ازل" "شاہد اقدسی عمامہ" "قطرہ لب ریز مطلع اول" "سائی مشعل نہ جیش" "گاہ اقرار" "سوہان زن آتش درونی" "شمشیر گر نگاہ خونی" مصرعہ آخر رباعی ؎

ع آئینہ بدست خود پرستی

وغیرہ جیسی ترکیبین اور محاورات کا برمحل استعمال فارسی زبان پر فیضی کی قدرتِ کاملہ کی دلیل ہے، جس نے اہلِ زبان کو اُس کے اعتراف پر مجبور کر دیا،

مثنوی کا اخلاقی پہلو

مثنوی مین جا بجا اخلاقی درس بھی ہے، مثلاً ایک درویش بادشاہ کو یہ نصیحت کرتا ہے،

ملکِ تو عجب کشیدہ خوانیست | بر خوان تو خلق میہمانیست
از دادۂ ایزدی برون دہ | از دادہ فزون تو ہم فزون دہ
چون کوس بزنی بنام درگاہ | یاد آر ز نالۂ سحرگاہ

با غیر کن آن ترانہ سنجی
کہ غیر چو بشنوی نرنجی

آخری سطر مین فیضی نے جس نصب العین کو بیان کیا ہے وہ ہر زمانہ مین مہذب اقوام کا اخلاقی قانون رہا ہے، فیضی بہ نسبت شاعر کے ایک فلسفی تھا، جیسا کہ خود کہتا ہے،

ع امروز نہ شاعرم حکیم ...... الخ

اس لیے اس کے کلام مین فلسفیانہ خیالات کا بھی اثر ہے، مثلاً :-

دریاب کہ عشق ترک ہستی ست ‏ ‏ نے شیوہ کالبد پرستی ست

چون مغز تو گشت پردہ دارم ‏ ‏ خود گو کہ بپوست چیست کارم

چون دیدہ ز صورت تو بستم ‏ ‏ وقتے است کہ معنیت پرستم

خلفائے راشدین

(طبع سوم)

اس مین خلفائے راشدینؓ کے ذاتی حالات و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارنامون اور فتوحات کا مفصل بیان ہے، قیمت :- عمر

مغز نغز

مثنوی مولنا روم کا عارفانہ انتخاب

مُرتبۂ

مولینا ابو بکر محمد شیث فاروقی رحمۃ اللہ علیہ ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

قیمت :- دو روپیہ، ملنے کا پتہ :- دائرہ مطبوعات مکتبہ جونپور اور دار المصنفین اعظم گڈھ

"منیجر"

کیمبرج کی موتمر مستشرقین عالم

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس

"محترم جناب اڈیٹر صاحب معارف۔ اعظم گڈھ

سلام مسنون : معلوم نہین تازہ موتمر مستشرقین کی رُوداد آپ تک پہنچی یا نہین، بصورت نفی مندرجۂ ذیل تذکرہ شاید ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوگا"

تمہید و مبادیات اگرچہ بعض حالات نے مجھے موتمر مین شرکت کے لئے کیمبرج جانے کا موقع نہ دیا لیکن مختلف لوگون سے چشم دید حالات سنے اور موتمر کے جو سرکاری نشریات دیکھے، اُن کی روشنی مین یہ معلومات ناظرین کے لئے پیش کئے جاتے ہین،

موتمر کا گذشتہ اجلاس استانبول مین ہوا تھا جس کی دو روُدادین معارف مین چھپ چکی ہین، وہان کی قرارداد کے مطابق تازہ اجلاس انگلستان مین ہوا، اس کی دعوت رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے دی تھی، اور ملکۂ برطانیہ نے سرپرستی قبول کی تھی، اور اس کے لئے کیمبرج کا انتخاب ہوا، جس کی وجہ غالباً اس کا جامعاتی قرون متوسطہ کا ماحول بھی ہے، اور شہر کا حسن بھی، کیونکہ آکسفرڈ اب ایک صنعتی شہر بن گیا ہے جس کی پرانی ہیئت بدل گئی ہے، یہ موتمر کا تیئسوان اجتماع تھا جو ۲۱ تا ۲۸ اگست ۵۴ء کو منعقد ہوا، آیندہ اجلاس تین سال بعد جرمنی مین ہوگا،

جو فرنگی استانبول کے اجتماع مین وہان کی اسلامی مہمان نوازی دیکھ چکے تھے، وہ کیمبرج کی ترقی یافتہ "آدم

مہذب مہمان نوازی پر اگر زبان سے اعتراف نہ بھی کریں تو دل میں ضرور شرمائے ہونگے، کالجوں کے اقامت خانے رہائش کے لئے مفت تھے، اور اسی کے باورچی اور ملازم بھی تھے، پھر بھی قیام و طعام کا اقل ترین خرچ تیس شلنگ روزانہ لیا گیا، جو عام ہوٹلوں سے بھی گران تھا،

دعوت نامے میں سب سے پہلے یہ درج تھا کہ پروٹسٹنٹ، کیتھلک اور یہودی عبادت کا انتظام کن مقامون پر کس کس وقت ہوگا، جب موتمر میں شرکت کرنے والے عربی نام والے صاحب بہادروں کو خود ہی فکر نہ ہو تو اسلام کو کون پوچھتا، جب مدعی خود سُست ہو تو گواہ کیوں چست ہوگا؟

برسوں کی بے تعلقی کے بعد پہلی مرتبہ اس دفعہ روس سے بھی دس بارہ نمایندے آئے تھے، انتخاب اگرچہ ایسے لوگوں کا کیا گیا تھا، جو انگریزی اچھی جانتے تھے، لیکن عصبیت یا خودداری کہ انھوں نے اپنی مادری زبان ہی میں سارے مقالے سُنائے مگر اُن کی اس جدت کو اور لوگوں نے رشک کی نظر سے دیکھا کہ ان مقالوں کے انگریزی ترجمے بھی وہ طبع کراکے ساتھ لائے تھے اور حاضرین میں مفت تقسیم کر دیئے گئے تھے، عموماً ہر شعبے میں ان نمایندوں نے حصہ لیا، فانوسی تقریروں کے ذریعے مزید دلچسپی پیدا کی گئی، اگرچہ فنی نقطۂ نظر سے ان رنگین فلموں کی سب نے داد دی، لیکن اس کا منشا چونکہ علم سے زیادہ دعایہ اور پروپیگنڈا تھا، اس لئے ہر شخص کا ردِ عمل اس کے حوصلے کے مطابق تھا، ان میں سے ایک "بزرگ" کی تحقیق و استنباط یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ مکہ جس "اللہ" کی پوجا کرتے تھے، وہ ایک بڑا سرمایہ دار تاجر سمجھا جا سکتا ہے، دوسرے "بزرگ" نے دو قدم آگے بڑھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ مسیلمۂ کذاب نے قرآن مجید کی نقالی کرکے اس کا منہ نہیں چڑایا تھا، بلکہ اصل میں مسیلمہ کذاب کے "ادبی شہ پاروں" کی نقالی کرکے پیغمبر اسلام نے قرآن مجید تیار کیا تھا، اگر خداوندانِ ماسکو کا منشا صرف خدا پرستی اور ہر ایک خدا کو ماننے والے دین کی مخالفت ہو تو البتہ ان تحقیقاتوں کو کسی نہ کسی حد تک درست کہا بھی جا سکتا تھا، لیکن جو لوگ غیر جانبداری سے سیاسیاتِ عالم کا مطالعہ کرتے ہیں اور جنھیں نہ روس سے دشمنی ہے، اور نہ امریکہ سے کوئی خوش عقیدگی، وہ اس طرح کی بوالعجبیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں، روس کا یہ منشا تو سمجھ میں آتا ہے کہ سوویٹ علاقہ میں بسنے والے سارے

مسلمانوں کو دہریہ اور اشتراکی بنایا جائے، اسی طرح اس کی اس سیاست کو بھی بااصول قرار دے سکتے ہیں کہ اپنے خفیہ کارندوں کے ذریعہ وہ ساری دنیا میں مذہب شکنی کے پرچار میں مشغول رہے، لیکن حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اپنے حریف امریکہ اور اس کے رفقا کا اثر گھٹانے، اور ان اسلامی ممالک کو جو اس وقت حریف کے زیرِ نگین تو نہیں لیکن زیرِ اثر ضرور ہیں، اپنا ہمنوا بنانے کی جب وہ کوشش کر رہا ہے، اور اس کے لئے حج کو ہر سال سرکاری اہتمام سے چند افراد بھیجے جاتے ہیں، اور قاہرہ کے سفارت خانے میں کثرت سے مسلمانوں کو مامور کرکے ان کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ پابندی سے نماز باجماعت مسجدوں میں پڑھا کریں، ایسی حالت میں اپنے مخفی نمایندوں کے ذریعہ نہیں، بلکہ علانیہ و مسلّمہ سرکاری نمایندوں کے ذریعہ، کیمبرج جیسے مقام پر ایسی حرکتیں کیوں کی جاتی ہیں جن سے روس کے حریفوں کو ایک مفت کا حربہ ہاتھ آتا ہے؟ یہ واقعہ ہے کہ آج کل سارے آزاد اسلامی ممالک امریکہ، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور بلجیم وغیرہ سے نالان ہیں، ان حالات میں روس کے لئے یہ آسان تھا کہ وہ اپنے کو مظلوموں کا ہمدرد ظاہر ہی نہیں بلکہ ثابت بھی کرے، اس کے لئے ایک آدھ ووٹ اسرائیل کے خلاف کبھی کبھی دیدینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی اعلان کردہ کلچری پالیسی پر عمل کرکے آزادی اور ناطرفداری کا حامی ہو، اور یہ پالیسی عملاً اندرونِ ملک کے مسلمانوں کے ساتھ برتی جائے، اور بیرونِ ملک ان حماقتوں کا سدِ باب کیا جائے جس کا کیمبرج میں مظاہرہ کیا گیا،

تقسیم کار | تقریباً نو سو نمایندوں کے اجتماع کے باعث کام کو بارہ شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جس کی سرکاری ترتیب یہ تھی،

۱- مصریات ۲- سامی لسانیات ۳- آشوریات

۴- ایران، آرمینیا، وسطی ایشیا، ۵- آلتائی (ترکی) السنہ ۶- ترکیات (تاریخ)

۷- ہندیات ۸- مشرق بعیدہ ۹- الف اسلام (السنہ، ادبیات وفنون لطیفہ)

۹- (ب) اسلام (تاریخ و مذہب) ۱۰- مشرق و مغرب کا تماس اور مشرقی ممالک کی عیسائیت

۱۰- افریقہ،

معلوم نہین اس تقسیم کی ترتیب کس اصول پر کی گئی، ہم کو بے وجہ بدگمانی نہین کرنی چاہئے،

منتخب مقالے | نظام عمل مین مقالے جس ترتیب سے درج ہین، اس کو برقرار رکھتے ہوئے چند ایسے عنوانون کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو معارف کے ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہین، (رموز: گ = انگریزی، ف = فرانسیسی، ج = جرمن):-

۱- مسٹر غنیم (گ) سقارہ مین تیسرے مصری خانوادے کے نئے سیڑھی دار اہرام کے ایک احاطے کی دریافت،

۲- J. Baamgartel. جے (گ) خانوادہ داریت سے قبل کا مصری فن تعمیر،

۳- عبدالرحمٰن بدوی (گ) قدیم مصری اصول تعمیر کے متعلق بعض لسانیاتی شواہد،

۴- Y. Yadin. (گ) تیسرے الفیہ قبل مسیح کے آغاز پر فلسطین و مصر کے حربی تعلقات،

۵- مسٹر حسن (گ) ابو الہول کے راز نئی کھدائیون کی روشنی مین،

۶- W. F. Albright. بنی اسرائیل کے خروج مصر سے متعلق چند ملاحظات،

۷- J. Rykman. (ف) وسطی عرب کے ثمودی کتبون پر عارضی تبصرہ،

۸- G. c. m. Rykman. (ف) وسطی عرب مین ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۲ء مین چٹانون پر دستیاب شدہ سبائی کتبون کی مختصر فہرست،

۹- سینٹ جان عبداللہ فلبی (گ) سعودی عرب مین ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۲ء کی کتبات کی تلاش کی مہم کا جغرافی اور عام تذکرہ،

۱۰- ایضاً- ملکہ سبا کے ملک کی تلاش (ایک فلم)،

۱۱- G. M. Fitzgerald (گ) ہکسوس بادشاہون کے قلعے اور جنگی رتھین (حضرت یوسفؑ کے زمانے مین یہی شاہی خانوادہ مصر پر حکمران تھا)

۱۲- H. Birkeland (گ) قدیم کلاسیکل عربی لہجے کا اتار چڑھاؤ (accent)

۱۳- J. Pirenne (ف) یونان اور سبا کے تعلقات، جنوبی عرب کی تاریخ اور روایات کا زمانہ معین کرنے کی ایک نئی اساس،

۱۴- W. Martin (گ) سامی السنہ کے صیغۂ امر کی اصلیت،

۱۵- مسٹر مستقلی (گ) سامی السنہ کا صیغۂ جمع،

۱۶- J. Schirmann. (گ) قرون متوسطہ کی عبرانی شاعری مین خوبصورت لڑکا، (امرد پرستی)

۱۷- C. J. Edmonds. (گ) عراق کے اہل حق،

۱۸- T. J. Bibby. (گ) ڈنمارک کی ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۴ء مین بحرین بھیجی ہوئی علمی مہم کا مختصر اور ابتدائی خاکہ

۱۹- Enrico Cerulli (گ) قرون متوسطہ کے مغربی فسانوی اقتباسات کا فارسی مخطوطات کے ایک نئے ذخیرے مین ذکر،

۲۰- R. Stiehl اور F. Altheim. (ج) بہرام چوبین کا افسانہ،

۲۱- R. F.rye. (گ) کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن وشمگیر کا اندرزنامہ،

۲۲- مسٹر موقر (گ) ایران کی تازہ اثریاتی دریافتین،

۲۳- احمد آتش (ف) شاہنامۂ فردوسی کی تکمیل کی تاریخ،

۲۴- V. Minorsky. (ف) اسلامی ایران کے جغرافیہ و تاریخ پر چند نشریات،

۲۵- مسٹر تیمور (ج) سیواس مین ۱۳۲۶ء کا ایک عربی و ترکی وقف نامہ،

۲۶- مسٹر منصور اوغلو (گ) قدیم اناطولی ترکی کے شخصی ناموں اور لقبوں پر چند ملاحظات،

۲۷- احمد آمرے (ف) ترکی زبانوں اور انڈو یوروپی زبانوں کے تعلقات، (اردو اور ترکی مین اتنی مشابہت ہے کہ اس کا لفظی ترجمہ گلابی اردو نہین بلکہ فصیح اردو ہوتا ہے)

۲۸- عثمان طوران (گ) قرون متوسطہ کے ترکون مین جہانگیری کا تصور،

۲۹- فائق رزمیت اوناث (گ) مورخ نشری کی حیات و تالیفات پر جدید تحقیقاتین،

۳۰- خلیل اینالجی (گ) عثمانی سلاطین ترکی کی فتوحات اور مقامی امراء و معززین،

۳۱- زکی ولیدی طوغان (ج) از بکیون کی رزمیہ نظم "خان نامہ" کی ممکنہ تاریخی اساس،

۳۲- طیب گوکبلگین، (ف) سلطان سلیمان قانونی کے عہد کے علاقہ رومیلی کی تنظیم، اور اسکا نظم و نسق،

۳۳- بکر صدقی بائکل (ج) سلاطین آل عثمان سے فیصلہ کن جنگ کے متعلق ازون حسن کی تیاریان اور جنگ کا آغاز،

۳۴ Deny (ف) سترہوین صدی عیسوی کا ایک عالم ترکیات علی بابا البرٹ بابونکی،

۳۵- ادلوجان چغتائی، (گ) عثمانی سلاطین کی بیویان

۳۶- احمد دانی (گ) تاریخ ہند کا پس منظر آثار قدیمہ کی روشنی مین،

۳۷- A silva Rego (گ) پرتگالی دستاویز خانون مین ہندی مواد،

۳۸- Richard whitehead (گ) جہانگیر کے کتبون پر منطقة البروج کی علامتین،

۳۹- Alfred Master (گ) ہندی اور اردو کی اصلیت، اور اُس کا آغاز،

۴۰- F. D Bargebuhr (گ) قصر الحمراء گیارہوین صدی عیسوی مین۔

۴۱- بیگم F. E. Day (گ) اموی ظروف اور برتن،

۴۲- J. V. Macmullan (گ) ابتدائی اسلامی کے کمبل؟

۴۳- ابو العلیٰ عفیفی (گ) ابن عربی کی تالیفات،

۴۴- ولید عرفات (گ) کتب سیرت مین منقولہ نظمون خصوصاً حضرت حسان بن ثابت کے اشعار کی صحت،

۴۵- محمد خلف اللہ (گ) چوتھی صدی ہجری مین اعجاز قرآنی کا تصور،

۴۶- مسٹر نزالی (ف) الفرزادی اور اس کی تالیف وصائس الشعر،

۴۷- L. A. Mayer (گ) اسلامی تعمیرات کے متعلق چند حقائق اور چند گتھیان،

۴۸- B. S. Rice (گ) عربی مخطوطات کے منقش سرورق کا ارتقاء،

۴۹- بیگم Van Berchem (ف) صحرائے الجزائر کے ریگ مین دفن شدہ شہر سدراتہ کی کھدائی کے دو موسمون کا نتیجہ،

۵۰- J. Walker. (گ) اموی اصلاحات سکہ سازی کے بعد کے اولین سکے،

۵۱- J. Robson (گ) اسناد اسلامی علم حدیث مین،

۵۲- G. Vajda (ف) پاریس کے کتب خانۂ عام کے چند عربی مخطوطات کے سماعات واجازات،

۵۳- G. Weil (گ) خلیل کے علم عروض کی کلید،

۵۴- C. Cahen (ف) بحر متوسط کے اسلامی ممالک کی معاشی اور سماجی تاریخ،

۵۵- G. Wiet (ف) مملوک سلاطین کا ایک حکمنامہ مکۂ معظمہ مین،

۵۶- مسٹر مہدی (گ) ابن خلدون کے علم عمرانیات کی اساس قدیم کلاسیکل فلسفہ اور اسلامی فلسفہ مین،

۵۷- M. Plessner (گ) طب اور سائنس پر عربی مخطوطون کی ایک عالمگیر فہرست،

۵۸- F. Gabrieli (ف) جغرافیۂ ادریسی کے کامل نسخے کی اشاعت کی تجویز،

۵۹۔ L. Massignon (گ) بی بی فاطمہؓ سے عورتون کی عقیدت کا اصل منشار،

۶۰۔ مسٹر ادریس (ف) زیری سلاطین کے زمانہ مین مالکیون کا شیعون سے مناقشہ گیارہوین صدی عیسوی مین (شمالی افریقہ مین)

اس کی توقع کم ہے کہ یہ مقالے کبھی یکجا شائع ہون گے، اکثر لوگ اپنے پسند کے رسالون مین اپنا مضمون دیدیتے ہین، اور بعض کے چھپنے کی کبھی نوبت ہی نہین آتی، اس کی وجہ ارباب موتمر کے پاس رقم کی کمی ہے، کیا ترقی یافتہ مغرب مین علم کی کساد بازاری اس سے کم ہے جس کی اہلِ مشرق کے متعلق شکایت ہوتی ہے؟

شاید اس مختصر رپورٹ مین کسی کو کوئی کام کی چیز مل جائے، مجھے خاص کر نمبر (۵) اور (۵۸) سے دلچسپی ہوئی۔

محمد علی

ذاتی ڈائری کے چند ورق،

(حصہ اول)

رئیس الاحرار مولٰنا محمد علی مرحوم کے سوانح وحالات، وقائعِ زندگی، جو صاحبِ تفسیر قرآن مولٰنا عبد الماجد دریا بادی مدیر صدق کے ذاتی مشاہدہ و تجربہ میں آئے، اس مین اُن کی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، محمد علی مرحوم کیا کچھ تھے، اس کی صحیح تصویر آپ کو اس کتاب مین نظر آسکتی ہے،

قیمت:- ؎ ہ

"منیجر دار المصنفین"

ادبیات

یومِ وفاتِ سیدؒ

از

جناب یحییٰ اعظمی

دلون مین پھر ہے تازہ یاد اس روئے منور کی — کہ پھر شب آگئی تئیسوین ماہِ نومبر کی

جہانِ علم و دانش مین ہے پھر تقریبِ غم برپا — کہ ہے تجدیدِ ماتم سیدِ پاکیزہ گوہر کی

اسی عنوان سے پھر بزمِ شبلی وقفِ ماتم ہو — نم افشانی وہی ہے آج ہر اک دیدۂ تر کی

وہ سید جس نے تحقیق و ہنر کو زندگی بخشی — وہ سید جس نے علم و فن کی خدمت زندگی بھر کی

وطن مین جس نے کی آراستہ مجلس معارف کی — سجائی جس نے محفل حکمت و دانش کے دفتر کی

گذاری عمر جس نے مدحِ سرکارِ دو عالم مین — حیاتِ طیبہ نذرِ حیاتِ پاک سرورؐ کی

رہا تا زیست جو مدحت طرازِ سرورِ عالمؐ — قلم نے جس کے لکھی سیرتِ اقدس پیمبرؐ کی

مشیت نے جسے اس کام پر مامور فرمایا — ازل سے یہ سعادت جس کو قدرت نے مقدر کی

رہے گا تا ابد دنیا مین فیضانِ حیات اُس کا
بھلائے گا زمانہ کس طرح یومِ وفات اُس کا

کہان بزمِ ہنر مین آہ اب وہ شمعِ نورانی — کہ تھی آئینۂ علم و معارف جس کی پیشانی

جسے سونپی تھی قدرت نے معارف کی جہانبانی — جسے تفویض تھی اقلیم دانش کی سلیمانی

نکات آموز اسرار و حکم تھی ہر نظر جس کی — کمال افروز تھی جس کے رخ اقدس کی تابانی

فروغ دین و دانش کا خزینہ جس کا سینہ تھا — ودیعت تھے جسے سب حکمت و اسرار نعمانی

ابھی جس کا لقب کل تک تھا دنیائے معارف میں — سلیمان سریر علم و دانش، شبلی ثانی

چمک اٹھتی تھی یکسر خاتم علم و ہنر اس سے — کہ تھا نقش نگین فضل، ہر نقش سلیمانی

ہوا رخصت جہان سے نقش بند سیرت اقدس — بجا ہے دفتر علم و معارف کی پریشانی

ہزار افسوس کب سے مسند استاذ خالی ہے — تماشا کردنی ہے محفل شبلی کی ویرانی

جوار مرقد استاذ میں اے کاش پیش آتی — یہ ساعت ایک دن بدقسمتی سی تھی جو پیش آنی

لیا سید کے جسم پاک کو آغوش میں اپنی — بنی خاک کراچی مہبط انوار ربانی

وطن کی سرزمین کو غم ہے اس حرمان نصیبی کا — دیار غیر میں مدفون ہے وہ گنج پنہانی

ہے مرقد کی زیارت سے بھی اب افسوس محرومی — بھلا مضطر نہ ہوں کیوں تشنگان فیض روحانی

دیار غیر کی مجبوریاں اور دوری منزل — کوئی پہنچے تو کیوں کر آہ بہر فاتحہ خوانی

دگر از مقدمت "بزم رفیقان" را بیارائی

کنون وقت است اے سید کہ بیرون از مزار آئی

....

باب التقریظ والانتقاد

"تاریخ مشائخ چشت"

از

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

مذکورہ بالا کتاب جناب خلیق احمد نظامی صاحب ام اے لکچرار شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی تصنیف ہے، جو ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہے، خلیق احمد نظامی صاحب ابھی ایک نوجوان اہل قلم ہیں لیکن انھوں نے اپنے متعدد مضامین اور تصانیف سے اہل علم کے حلقہ میں اپنے کو کافی روشناس کرا لیا ہے، اور اپنی مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھا تو امید ہے کہ بہت جلد اردو زبان کے مصنفوں کی صف اول میں آجائینگے، زیر نظر کتاب کی ضخامت [illegible] صفحے ہے، اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور مسرت بھی کہ ایک نوجوان لکچرار نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اس کمسنی میں اتنی ضخیم کتاب لکھ ڈالی، کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تدوین کے وقت نوجوان مؤلف کے سامنے تمام ضروری ماخذ بلکہ بعض کمیاب تذکرے بھی موجود تھے جن کی چھان بین میں بڑی محنت و مشقت کی ہے، اور ان کی مدد سے بزرگان چشت پر ایک محققانہ اور دل آویز تاریخ لکھدی ہے جس کے لئے ارباب علم و فن کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے، زبان اور اسلوب بیان دونوں میں دلکشی ہے، بعض غوامض و دقائق کو اپنی غیر معمولی قوت اخذ سے دلچسپ اور عام فہم بنانے کی بھی کوشش کی ہے،

کتاب کے نام "تاریخ مشائخ چشت" سے خیال ہوتا ہے کہ یہ تمام خواجگان چشت کی تاریخ ہوگی،

لیکن اس میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے صرف بارہ صوفیہ کرام کے حالات ہیں جو کتاب کے صفحہ ۳۶۶ سے شروع ہوتے ہیں، اس سے پہلے کے ۳۶۵ صفحے گویا اس کی تمہید ہیں، یہ ۳۶۵ صفحے دلچسپ، مفید اور پرمغز ضرور ہیں لیکن جب لائق مؤلف نے دیباچہ میں اپنے اس ارادہ کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ چشتیہ سلسلہ کی تاریخ پانچ جلدوں میں مرتب کریں گے، اور پہلی جلد حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے لیکر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی تک کے بزرگوں پر مشتمل ہوگی، تو ایسی حالت میں زیر نظر کتاب کے صفحہ ۱۳۵ سے ۲۳۰ صفحے تک چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے تھوڑے تھوڑے اور ادھورے حالات قلمبند کرنا چنداں ضروری نہ تھا، اسی طرح "مشائخ چشت کا نظام اصلاح و تربیت" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں زیادہ تر انہی مشائخ کے اسماء اور حوالے ہیں جن کے حالات پہلی جلد میں لکھے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے، اُن کو زیر نظر کتاب میں شامل کرنے میں شاید لائق مؤلف کو اپنے ذوق کی تسکین محسوس ہوئی ہو، اس لئے اس میں اُن کو پیش کر کے اپنے ناظرین کو بھی بظاہر محظوظ کرنے کی کوشش کی ہے،

کتاب کا باب اول ص ۳۷۶ پر سے شروع ہوتا ہے، اس سے پہلے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی، اخلاقی اور مذہبی حالات پر تبصرہ ہے، ان کے مطالعہ سے مفید معلومات میں اضافہ ضرور ہوتا ہے، لیکن اگر یہ دکھایا جاتا کہ یہ حالات اُن بزرگان دین کی مساعی جمیلہ کے نتائج تھے تو یہ اوراق بے شک قیمتی ہوتے، لیکن امید ہے کہ تصنیف و تالیف میں حشو و زوائد کی خامیاں لائق مصنف آگے چل کر اپنے حسن ذوق، تجربے اور کہنہ مشقی سے خود بخود دور کریں گے،

فاضل مؤلف نے ماخذوں کے سلسلہ میں معاصر تذکروں اور کتابوں کا حوالہ التزاماً دیا ہے، اور یہ زیر نظر کتاب کا نمایاں وصف ہے، لیکن معلوم نہیں انھوں نے ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی تاریخ لکھتے وقت ثانوی درجے کے ماخذوں مثلاً ذکاء اللہ کی "تاریخ ہند" اردن کی "لیٹر مغلز" اسمتھ کی "اکبر" سر جادو ناتھ سرکار کی "ہسٹری آف اورنگ زیب" اور بینی پرشاد کی "ہسٹری آف جہانگیر" کے حوالوں سے اپنی کتاب

کی تابناکی کو کیوں داغدار کیا ہے، اُن کے ماخذوں کے حوالوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اوریجنل کتابوں کے مطالعہ میں کوتاہی نہیں کی ہے، مگر تذکرۃ الاولیاء، گلزار ابرار، خیر المجالس، کشف المحجوب اور صبح الاعشیٰ کے ترجموں کے حوالے دیکھ کر تعجب ہوا، اور پھر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ کہیں سیر الاولیاء کی اصل فارسی کتاب اور کہیں اُس کے اردو ترجمے کے حوالے ہیں،

ص ۱۵۱ پر فتوح السلاطین مترجمہ محمد یوشع درج ہے، مترجمہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، غالباً مرتبہ مراد ہے، ص ۲۹۹ پر امیر حسن سجزی (جامع الفوائد) مرقوم ہے، الفوائد تو اُن کی کوئی کتاب نہیں، شاید فوائد الفواد لکھنے کے بجائے مؤلف نے الفوائد لکھ دیا ہے،

فارسی ماخذوں کے ترجمے میں ہونہار مؤلف کا محتاط قلم احتیاط سے کہیں کہیں تجاوز کر گیا ہے، مثلاً ص ۱۵۲ پر "ازیں مقدم در تمام شہر دہلی شور افتاد" کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ "اس خبر سے تمام شہر میں ایک تہلکہ پڑ گیا، اور ہر طرف کہرام مچ گیا" "تہلکہ پڑ گیا" بالکل کافی تھا، "اور ہر طرف کہرام مچ گیا" کے اضافہ کی ضرورت نہ تھی، ص ۸۰ پر ہے کہ شیخ حسام الدین چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام سے تعلق رکھتے تھے، اور حضرت محبوب الٰہی نے اس کے متعلق فرمایا تھا، کہ "شہر دہلی در حمایت اوست" (دہلی اس کی حمایت میں ہے) لیکن سیر الاولیاء کے ص ۲۵ پر یہ جملہ خود شیخ حسام الدین ملتانی کے متعلق کہا گیا ہے، معلوم نہیں لائق مؤلف نے اُس کو چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام کی طرف کیوں منسوب کر دیا، تاریخ فیروز شاہی مؤلفہ ضیاء الدین برنی کے ص ۳۴۳ کے اس جملہ "...... طاقیہ و توبہ و مسواک پاکی می فرمود" کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے "ہر ایک کو طاقیہ عطا فرماتے، مسواک دیتے اور توبہ کراتے تھے" اس میں "پاکی" کا ترجمہ نہیں کیا گیا، پھر "مسواک دیتے" اور "توبہ کراتے" میں تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھنا چاہیے تھا، کہیں فارسی کو اردو قالب میں ڈھال کر جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس کی تصریح کر دینے کی بھی ضرورت تھی کہ یہ کسی مسلسل عبارت کا ترجمہ ہے یا تلخیص، مثلاً ص ۸۹ پر تاریخ فیروز شاہی کے حوالہ سے جو اردو عبارت حوض میں درج کی گئی ہے، وہ بظاہر ترجمہ معلوم ہوتی ہے لیکن تاریخ فیروز شاہی میں ایسی کوئی مسلسل عبارت نہیں

لیکن ان فروگذاشتوں سے کتاب کے اصلی وصف پر کوئی حرف نہیں آتا،

کہین کہین بغیر حوالہ دیئے ہوئے ایک بات کہی گئی ہے مثلاً ص ۱۸۰ پر ہے کہ امیر خسرو نے اُن کے (یعنی مولانا شہاب الدین امام) کے متعلق لکھا ہے،

او چو ابر کرم بفرق جہان | زیر کان چون صدف کشادہ دہان
شمع من یافتہ ضیا از وے | مس من گشتہ کیمیا از وے

معلوم نہین فاضل مؤلف نے یہ اشعار کہان سے لئے ہین، میرے علم مین تو یہ اشعار امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کے خاتمہ کے ہین، جو امیر خسرو نے اپنے استاد مولانا شہاب الدین مہمرہ کے لئے لکھے ہین، لائق مؤلف نے معلوم نہین کیسے یہ اشعار مولانا شہاب الدین امام کی طرف منسوب کر دیئے ہین، اور پھر یہ دونون شعر یکے بعد دیگرے نہین ہین، بلکہ دونون کے درمیان گیارہ اشعار اور ہین،

مؤلف نے ص ۶۹ پر مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کی تصنیف السنۃ الجلیہ فی الچشتیۃ العلیہ کے بارہ مین لکھا ہے کہ

"یہ کتاب بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے لیکن اس مین ایک شدید نقص ہے اور وہ یہ کہ موضوع ملفوظات کو بڑی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے ...... مولانا تھانوی جیسے عالم کا جعلی ملفوظات کو محض شہرت عام کی بنا پر استعمال کرنا تعجب خیز ہے"،

جعلی ملفوظات سے مراد خواجگان چشت کے ملفوظات کے وہ مجموعے ہین جو ان کے نام سے منسوب ہین، اُن کے غیر معتبر اور جعلی ہونے کے ثبوت مین پروفیسر محمد مجیب (شاید پروفیسر محمد حبیب مراد ہون) کے ایک انگریزی مضمون کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ موضوع ایک طویل بحث کا محتاج ہے لیکن شاید لائق مؤلف اور خود پروفیسر حبیب نادلطنہ کو یہ تسلیم کرنے مین تامل نہ ہوگا کہ جو رسالے خواجگان چشت کے نام سے منسوب ہین، وہ اگر اُن کے قلم اور ہاتھ سے نہین لکھے گئے، تو کم از کم قدیم العہد ضرور ہین، پھر ان کو قدیم ماخذ کی طرح استعمال کرنے مین کیا

ہرج ہے، اور اگر ان کو رد کر دیا جائے تو پھر فاضل مؤلف یہ بتائین کہ اُن بزرگون کے حالات و تعلیمات قلمبند کرنے کا کوئی اور ذریعہ بھی باقی رہ جاتا ہے؟ یا ان کو رد کرکے وہ ان بزرگان دین کے ادھورے اور تشنہ حالات ہی قلمبند کرنے پر اکتفا کر لینا چاہتے ہین، لائق مؤلف اور پروفیسر حبیب دونون اخبار الاخیار کے مصنف مولانا عبد الحق محدث دہلوی کے بے حد قائل اور معترف ہین، اخبار الاخیار (مطبوعہ ہاشمی، مطبع میرٹھ) کے ص ۷۰ پر حضرت نظام الدین اولیاء کے اس قول کو نقل کیا گیا ہے کہ خواجگان چشت نے کوئی کتاب نہین لکھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبد الحق ملفوظات خواجگان چشت کو ان بزرگان دین کی تصنیف تسلیم کرنے مین متامل ہین، لیکن پھر بھی وہ ان ملفوظات کے حوالے بار بار دیتے ہین، اخبار الاخیار کے ص ۲۲ پر لکھتے ہین کہ

"در دلیل العارفین کہ خواجہ قطب الدین بختیار اوشی از ملفوظات خواجہ قدس سرہ جمع کردہ مذکور است"

پھر اسی مجموعہ سے حضرت خواجہ معین الدین کی تعلیمات بھی پیش کی ہین، جو اُن کی کتاب کے تقریباً ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل ہین، دلیل العارفین کا حوالہ ص ۲۵ پر بھی ہے اور اس سے ایک روایت بھی نقل کی گئی ہے، پھر ص ۵۲ پر ہے کہ

"بعضے از ملفوظات گنج شکر کہ بخط شیخ نظام الدین اولیاء یافتہ اند ....."

مولانا عبد الحق کا ان ملفوظات کا بار بار ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ خواجگان چشت کے حالات و تعلیمات لکھتے وقت ان ملفوظات کو سامنے رکھنا ناگزیر ہے، یہ تسلیم ہے کہ ان ملفوظات کے مجموعون کے موجودہ نسخون مین سنین اور اسماء کی بہت سی غلطیان ہین، ان کی بعض روایتون کو الحاقی بھی کہا جا سکتا ہے، ان مین یہ نقائص اس لئے بھی پیدا ہوئے کہ مجاور ان کو عوام مین فروخت کرنے کے لئے چھاپتے رہے، اُن کی کتابت و طباعت مین کوئی خاص اہتمام نہین کیا گیا، لیکن اگر اُن کو محنت سے اڈٹ کیا جائے اور جابجا مفید حواشی لکھ دیئے جائین، تو ان کے مفید اور قابل قدر ہونے مین کوئی شک و شبہ نہین ہو سکتا، رہی یہ بات کہ ان مین بعض واقعات ایسے ہین جو قابل قبول نہین تو ان ملفوظات ہی پر کیا منحصر ہے، اگر سوء ظن اور بد عقیدگی کی عینک لگا کر سیر الاولیاء، فوائد الفؤ

درجتی کہ اخبار الاخیار کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بھی ویسی بہت سی باتیں نکلیں گی جن کی بنیاد پر ملفوظات خواجگان چشت کو غیر معتبر اور جعلی قرار دیا گیا ہے۔

بعض سنین لکھتے وقت لائق مؤلف کو کچھ زیادہ غور و فکر سے کام لینا چاہیئے تھا۔ مثلاً ص ۹۰ پر ہے شیخ علی ہجویری المتوفی ۴۶۵ھ اور ۴۶۹ھ کے درمیان پروفیسر محمود شیرانی مرحوم نے رسالہ اردو جنوری ۱۹۳۳ء کے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ مخدوم (یعنی علی ہجویری) کی وفات باصح اقوال ۴۶۵ھ (یعنی ۱۰۷۲ء) میں ہوئی، اور اسی کو قبول کر لیا گیا ہے، حضرت خواجہ معین الدین کی تاریخ وفات وثوق کے ساتھ ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء بتائی گئی ہے، (ص ۱۳۱) حضرت خواجہ کی زندگی کی تمام تاریخیں قیاسی ہیں، اگر مؤلف کسی مستند حوالہ یا دلائل سے ثابت کرتے کہ ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء ہی صحیح تاریخ وفات ہے تو ایک بڑی گتھی حل ہو جاتی، مشارق الانوار کے مؤلف مولانا رضی الدین حسن صغانی (صنعانی نہیں) کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے کہ محمد غوری کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہونے سے دس سال قبل بدایون میں پیدا ہوئے، (ص ۱۴۳) محمد غوری کی فتوحات کا سلسلہ ۵۷۱ھ سے شروع ہوتا ہے، اس لحاظ سے بقول مؤلف مولانا رضی الدین حسن صغانی ۵۶۱ھ میں پیدا ہوئے، معاصر تذکروں میں تو نہیں لیکن مآثر الکرام، اور تذکرہ علمائے ہند میں اُن کی پیدائش کی تاریخ ۵۷۷ھ لکھی ہوئی ہے، اور نزہتہ الخواطر میں ۵۵۷ھ مرقوم ہے، ان تینوں تذکروں میں یہ بھی ہے کہ مولانا موصوف کی پیدائش لاہور میں ہوئی، زیر تبصرہ کتاب کے مؤلف نے فوائد الفواد کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولانا محمد غوری کی فتوحات سے تقریباً دس سال قبل بدایون میں پیدا ہوئے تقریباً دس سال قبل" فوائد الفواد میں تو مذکور نہیں، اس میں یہ بھی تصریحاً نہیں کہ وہ بدایون میں پیدا ہوئے صرف یہ ہو کہ

"او (یعنی صاحب مشارق) از بداؤن بود"

اس اجمالی بیان سے وثوق کے ساتھ تو یہ نہیں کہا جا سکتا، کہ بداؤن ان کا مولد تھا، ممکن ہے کہ صرف منشاء ہو، شاید اپنے مولد لاہور سے آکر بداؤن میں نشو و نما اور تعلیم پائی ہو،

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ "کشف المحجوب جیسا کہ اندرونی شہادت سے ظاہر ہے لاہور میں لکھی گئی" (ص ۹۹) پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے اس بیان سے ہم اتفاق کرتے ہیں کہ شیخ علی ہجویریؒ خود اثنائے تصنیف میں ہندوستان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ ہندوستان کے باہر لکھ رہے ہیں، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"در اندر ہندوستان مردے دیدم کہ مدعی بود بہ تفسیر و تذکیر و علم با من اندرین معنی مناظرہ کرد"

ایک دوسرے مقام پر یہ عبارت ملتی ہے،

"در ہندوستان دیدم کہ اندر زہر قاتل کرمی پدید آمدہ بود و زندگی وے بدان زہر بود"

ص ۱۹۰ پر ہے کہ "حقیقت یہ ہے کہ مشائخ چشت بالخصوص دور اول کے بزرگ ہمیشہ سلاطین اور سیاست سے علٰحدہ رہے، اور انہوں نے درباداری کو ہمیشہ اخلاق اور مذہب دونوں کی توہین سمجھا" یہ رائے محل نظر بھی ہے اور تاریخی حقائق کے خلاف بھی، مشائخ چشت درباداری، جاہ طلبی، اور امارت پسندی کو تو واقعی ایک ذلیل چیز سمجھتے رہے بلکہ اس قسم کی دنیاداری کو اپنی روحانی موت کے مترادف قرار دیتے تھے لیکن اگر وہ مذہب کی خدمت گذاری اور خلق اللہ کی فلاح و بہبود کو بھی نظر انداز کر کے سلاطین اور سیاست سے گریز کرتے رہے، تو گویا اسلام کی سچی تعلیمات پر عامل نہیں رہے، اور ایسا کہنا درحقیقت انکے تمام مشن کی نوعیت پر ایک ضرب کاری لگانا ہے، یہ وضاحت سے لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست علٰحدہ چیزیں نہیں ہیں، خصوصاً جب خواجگان چشت اسلام کے علم بردار بن کر ہندوستان کے افق پر نمودار ہوئے تو اس وقت اپنے زمانہ کے سلاطین اور سیاست سے بالکل کنارہ کش اور علٰحدہ رہ بھی نہیں سکتے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگان دین کا عمل کچھ ایسا رہا کہ وہ سلاطین وقت سے دور بھی رہے، اور قریب بھی، اُن سے بے نیاز بھی رہے، اور ان پر اثر انداز بھی ہوئے، دور اول کے بزرگان چشت کی زندگی میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن کی بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ انھوں نے سلاطین اور امرائے کسی نہ کسی نہج سے تعلقات بھی رکھے، اور ان سے مستغنی بھی رہے، لائق مؤلف سیر الاولیاء کو

ایک مستند تذکرہ تسلیم کرتے ہیں، اسی کی ایک روایت ہو کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے صاحبزادوں کے قبضہ میں اجمیر کے پاس ایک گاؤں تھا، وہاں کے مقطع نے لگان مقرر کرنے میں اُن کو کچھ زیادہ پریشان کیا تو صاحبزادوں نے اپنے والد بزرگوار سے عرض کی کہ وہ دہلی جاکر سلطان سے ایک فرمان لے آئیں، حضرت خواجہ نے اپنے صاحبزادوں کی خاطر دہلی کا سفر کیا، اور جب وہ اپنے مرید حضرت بختیار کاکیؒ کے پاس پہونچے، اور اُن کو اپنے مرشد کی تشریف آوری کی وجہ معلوم ہوئی، تو انھوں نے مرشد کو سلطان کے پاس جانے سے روک دیا، اور خود سلطان کے یہاں قدم رنجہ فرمایا، سلطان کو جب معلوم ہوا کہ آپ نے کس لئے زحمت فرمائی ہے، تو اس نے اسی وقت ایک فرمان لکھا، اور اشرفیوں کی تھیلی پیش کی، مراۃ الاسرار کے مؤلف نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے، اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے التمش سے ملنے کے لئے دہلی آنے پر بعض اہم نکتے بتائے ہیں، جن کو ہم اس ریویو میں زیر بحث لانا نہیں چاہتے، ہمارے لائق مؤلف کی بھی نظر سیر الاولیاء کی اس روایت پر پڑی ہے اور انھوں نے اپنی کتاب کے ص ۱۵۲ پر اس کو تفصیل سے لکھا ہے لیکن یہ روایت نقل کرتے وقت کچھ ترمیم سے کام لیا ہے، حضرت خواجہ معین الدینؒ جس ضرورت کے لئے دہلی تشریف لائے تھے اس کو بیان کرنے کے بجائے یہ لکھدیا ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے مرید سے ملنے کے لئے دہلی تشریف لائے، اور یہ اس لئے لکھا کہ ان کا دعویٰ اپنی جگہ پر محفوظ رہے، کہ خواجگان چشت بادشاہوں سے ملنا پسند نہ کرتے تھے، خواجگان چشتؒ کے ملفوظات کے علاوہ سیر الاولیاء اور فوائد الفواد کی روایتوں سے ثابت ہے کہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کو خاک سے پاک کر دیا، سیر الاولیاء ہی میں ہو کہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں سلطان ناصر الدین محمود اور بلبن دونوں حاضر ہوا کرتے تھے، اسی تذکرہ میں یہ بھی ہے کہ شیخ علی چشتیؒ چشت سے آکر دہلی میں مقیم تھے، چشت کی سجادہ نشینی کے لئے دو بزرگ اُن کو دہلی سے لیجانے کے لئے آئے، شیخ علی چشت جانے کے لئے تیار ہوئے تو اس کی خبر سلطان غیاث الدین بلبن کو ہوئی، وہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اُن کے قدموں پر گر کر قسم کھائی کہ اگر آپ چشت تشریف لے گئے تو میں بھی اپنی مملکت چھوڑ کر آپ کے ساتھ وہاں

چلا چلوں گا، خواجہ علی نے فرمایا تم نے خداوند تعالیٰ کے بندوں کو آرام و آسایش پہونچانے کا عہد کیا ہے، اور تمام لوگ تمھاری وجہ سے آسودہ ہیں، اگر تم میرے ساتھ گئے تو ایک دنیا پریشانی میں مبتلا ہو جائے گی، اور تم سے مواخذہ ہوگا، لیکن سلطان نے جواب دیا کہ میں آپکے قدموں سے دور رہنا نہیں چاہتا، خواجہ علی نے سلطان کو اپنا اس قدر عقیدتمند پایا، تو دہلی میں قیام کرنا گوارا کر لیا (سیر الاولیاء ص ۲۱۲) یہ صحیح ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے کسی سلطان سے ملنا پسند نہیں کیا، لیکن تمام مستند تذکروں خصوصاً اخبار الاخیار میں ہے کہ علاء الدین خلجی کے شہزادے خضر خان اور شادی خان اور اس دربار کے بڑے بڑے امراء اُن کی خدمت میں فیوض و برکات حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے، لائق مؤلف کے لائق استاد پروفیسر محمد حبیب اپنی انگریزی کتاب "امیر خسرو دہلوی" کے ص ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ

"علاء الدین کی حکومت کے آخری زمانہ میں شیخ (یعنی شیخ نظام الدین اولیاء) کی شہرت منتہائے کمال پر پہونچ گئی، ولی عہد خضر خان شیخ کا گہرا معتقد ہو گیا، شاہی خاندان کا ہر فرد، ریاست اور محل کا ہر ملازم اس وسیع حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا"

پروفیسر حبیب نے ضیاء الدین برنی کی تاریخ سے ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے، جس سے برنی کے اس تاسف کا اظہار ہوتا ہے کہ ہزاروں فرسنگ سے لوگ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی زیارت کو آتے تھے لیکن علاء الدین کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی کہ یا تو وہ خود شیخ کی زیارت کو جائے، یا اُن کو اپنے دربار میں بلائے، اگر بزرگان چشت کا سلاطین وقت سے علیحدہ رہنے کا مسلک ہوتا، تو مولانا برنی اس قسم کے تاسف کا اظہار نہ کرتے، شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں ہے کہ جب سلطان فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو حضرت شیخ نصیر الدین چراغؒ نے سلطان فیروز شاہ کو پیغام دیا کہ آپ وعدہ کریں کہ خلق کے ساتھ عدل و انصاف کریں گے، ورنہ ان بیکس بندوں کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ سے دوسرا فرمانروا طلب کیا جائے، سلطان فیروز نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں خداوند تعالیٰ کے بندوں سے حلم و بردباری کے ساتھ پیش آؤں گا، اور ان پر انصاف و محبت سے حکومت کروں گا، حضرت شیخ نے

جواب بھیجا تو کہلایا کہ اگر آپ خلق کے ساتھ خلق و مروت سے پیش آئیں گے، تو ہم بھی اللہ تبارک و تعالیٰ سے آپ کے لئے چالیس سال کی حکومت کے لئے دعا کریں گے، اور آخر کار وہی ہوا، جو شیخ نے فرمایا تھا (تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۰) اسی تاریخ میں یہ بھی ہے کہ فیروز شاہ کا لائق وزیر خانجہان حضرت نصیر الدین چراغ کا مرید تھا، اور اس کی خدا ترسی اور عدل پروری کی جلا انہی کی صحبت میں ہوئی، (تاریخ فیروز شاہی ص ۴۲۳، ۴۲۴)

حضرت نصیر الدین نے اپنے مریدوں کو جہاں ترک و تجرید کی تعلیم دی، وہاں ایک شاہی ملازم کو تلقین کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا (خیر المجالس مجلس ہفتاد و ہشتم)

مراد اہل طریقت لباس ظاہر نیست   کمر بخدمت سلطان ببند و صوفی باش

ایک لشکری اُن کی خدمت میں آیا تو اس کو مخاطب کر کے فرمایا، اگر طلب دنیا میں نیت اچھی ہو تو وہ فی التحقیق طلب آخرت ہے، (خیر المجالس مجلس ہشتاد و پنجم)

پھر یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ مشائخ چشت کے دور اول کے بزرگ حکمراں طبقہ سے علحدہ رہے، اور ان کے نزدیک حکومت وقت سے تعلق رکھنا روحانی موت کے مترادف تھا، (ص ۱۹۴)

اس قسم کے ضعیف استنباط اور استدلال کے اور بھی نمونے ہیں، مثلاً ص ۲۹۰ پر ہے "ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے" یہ جملہ ان کے (یعنی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے) افکار کا مکمل ترجمان اور چشتیہ سلسلہ کے اصولوں کا بہترین آئینہ دار ہے" "ہر قوم ...... گاہے" جملہ نہیں ہے مصرع ہے، لائق مؤلف کے ذوق سلیم سے یہی امید ہے کہ انھوں نے اس مصرع میں راست کو معنی سچ نہیں پڑھا ہوگا، بلکہ "ما" "است" مراد لیا ہوگا، اب اس کے یہ معنی سمجھے جائیں کہ ہر قوم کی ایک راہ ہے، ایک دین ہے اور ایک قبلہ گاہ ہے، تو یہ ایک امر واقعہ کا اظہار ہے، اس کو افکار کا مکمل ترجمان اور اصولوں کا بہترین آئینہ دار ہونے سے کیا تعلق ہے اور اگر مؤلف اس مصرعہ کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ ہر قوم کی راہ سچی ہوتی ہے، اس کا دین اور قبلہ گاہ بھی سچا ہوتا ہے، اور یہ سمجھ کر اس کو حضرت نظام الدین اولیاء کے افکار کا مکمل ترجمان اور چشتیہ سلسلہ کے اصولوں کا بہترین آئینہ دار کہا گیا ہے، تو یہ صریحاً بزرگان چشت پر ایک بہتان عظیم ہے، پھر ایک بات جو اضطراراً یا اتفاقاً کسی موقع پر کہی گئی ہو اس کو کوئی کلیہ بنانا بالکل صحیح نہیں، اسی طرح امیر خسرو کے

کسی ایک شعر (ص ۳۰۰) سے ان کا یا اُن کے سلسلہ کے بزرگوں کا مسلک ظاہر کرنا بالکل صحیح نہیں،

ص ۳۰۳ پر فوائد الفواد کے حوالہ سے یہ لکھا گیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے پوچھا کہ ایک ہندو کلمہ پڑھتا ہے، اللہ کی وحدانیت اور رسول کی رسالت پر اعتقاد رکھتا ہے لیکن جونہی مسلمان آتے ہیں خاموش ہو جاتا ہے، اس کی عاقبت کیسی ہوگی، لائق مؤلف اس کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایسے لوگوں کے متعلق صرف اتنا فرمایا تھا:

"معاملۂ او بحق است، تا حق چہ کند، انشاء عفاء و انشاء عذب"

لیکن اس جملہ کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت ابو طالب کی موت کے وقت کی جو روایت بیان کی ہے، وہ بھی نقل کر دی جاتی تو حضرت نظام الدین اولیاء کا قول اور بھی واضح ہو جاتا، لیکن اس کو حذف کر کے مؤلف نے نفس واقعہ کو کچھ سے کچھ بنا دیا،

کہیں کہیں بیانات میں تضاد اور غلو بھی پیدا ہو گیا ہے، مثلاً ص ۳۰۰ پر ہے کہ اسلام اور اسلام کے اصولوں کی اشاعت کے لئے جو طریقہ کار مشائخ چشت نے اختیار کیا تھا، وہ مروجہ طریقہ سے بالکل مختلف تھا، وہ زبان سے کسی اصول کی تبلیغ و اشاعت کو بے سود و بے کار سمجھتے تھے لیکن ص ۲۴۹ پر ہے کہ مولانا ضیاء الدین برنی فرماتے ہیں کہ "میں ایک دفعہ سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر تھا، اشراق کے وقت سے چاشت تک آپ کے جان بخش کلمات اور روح افزا گفتگو سننے میں مشغول رہا،" گفتگوؤں میں آخر اسلام اور اسلام کے اصولوں کی اشاعت ہی تو ہوتی تھی، اور پھر یہ مجلسیں کس لئے ہوتی تھیں، یہ ملفوظات کاہے کو قلمبند کیے جاتے تھے، اور مختلف سمتوں میں مریدین اور خلفاء کاہے کو بھیجے جاتے تھے، ان سے تبلیغ ہی کا کام تو لیا جاتا تھا، یہ ضرور ہے کہ ان بزرگانِ دین کا عمل صالح پر زیادہ زور تھا، لیکن یہ کہیں ثابت نہیں کہ وہ زبان سے تبلیغ و اشاعت کو بے سود و بے کار سمجھتے تھے،

ص ۲۷۹ پر ہے کہ امیر خسرو، امیر حسن سجزی، ضیاء الدین برنی، وغیرہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مخصوص

مریدین میں تھے، لیکن خلفاء نہ تھے، سیر الاولیاء اور اخبار الاخیار میں ان تینوں بزرگوں کا ذکر حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء کے زمرہ ہی میں کیا گیا ہے، بعض تذکرے مثلاً خزینۃ الاصفیاء میں تو وضاحت کے ساتھ ہے، کہ تینوں خلفاء میں تھے، کسی تذکرہ میں یہ نظر سے نہیں گذرا کہ وہ خلفاء نہ تھے، لائق مؤلف کی نظر سے کسی تذکرہ میں ایسا کوئی بیان گذرا ہے تو اس کا حوالہ دینا چاہئے تھا، بات یہ ہے کہ مؤلف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ بزرگان چشت شاہی دربار سے تعلق نہیں رکھتے تھے، مذکورۂ بالا تینوں بزرگ ایک عرصۂ دراز تک شاہی دربار سے منسلک رہے، تو مؤلف نے اسی میں اپنی بھلائی دیکھی کہ ان تینوں بزرگوں کو خلافت ہی سے محروم کر دیا جائے،

زیر نظر کتاب کی ان فروگذاشتوں کی نشان دہی سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس کے مفید محققانہ، پُرمغز اور کارآمد ہونے سے انکار کیا جائے، اور اگر کوئی ایسا کرے تو یقیناً اس میں حسن ذوق کا فقدان ہوگا، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب بڑی قابل قدر ہے، اور صالح ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے، یہ اس لئے بھی تعریف کی مستحق ہے کہ ایک نوجوان مؤلف کی لکھی ہوئی ہے جن کی ذات پر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کو فخر کرنا چاہئے، ندوۃ المصنفین بھی شکریہ کا مستحق ہے کہ طباعت و کتابت کی مشکلوں اور کاغذ کی گرانی کے باوجود ... صفحے کی یہ ضخیم کتاب عمدہ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے ساتھ شائع کی، جس کی قیمت عہ ہے،

بزم صوفیہ

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

اس میں شیخ ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت جہانیان جہاں گشتؒ اور اشرف جہانگیر سمنانیؒ وغیرہ بزرگان دین و مشائخ وقت کے حالات و تعلیمات ہیں، اور اپنے عہد کے مذہب و تصوف و اخلاق و معاشرت پر یہ حضرات کس حد تک اثر انداز ہوئے، اس کی پوری تفصیل اس میں موجود ہے، قیمت :- صہ/

منیجر

مطبوعات جدیدہ

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۳۰۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت غیر مجلد للعہ، مجلد ...

مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ،

یہ کتاب فاضل مصنف کی ایک عربی تالیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا نہایت فصیح اردو ترجمہ ہے، اس لئے اس کو ترجمہ کے بجائے تصنیف ہی کہنا مناسب ہوگا، اس کا پہلا اڈیشن آج سے آٹھ دس سال پہلے شائع ہوا تھا، اب ترمیم و اضافہ کے ساتھ دوسرا اڈیشن نکلا ہے، اس میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ گویا نئی کتاب بن گئی ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ انسانی تاریخ کے اس دور میں جب دنیا سے خدا شناسی مٹ چکی تھی، ہر طرف جاہلیت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، انسان اخلاقی پستی کی تحت الثریٰ میں پہنچ چکا تھا، اسلام عالم انسانیت کے لئے سراج منیر بن کر آیا، اور دین و دنیا کے متعلق انسانوں کے نصب العین اور ان کے عقائد و تصورات میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا، اور جاہلیت کے سارے تصورات اور ان سے پیدا شدہ خرابیوں کو مٹا کر خدا شناسی کی روح پیدا اور اخلاق فاضلہ سے آراستہ ایک ایسی قوم پیدا کر دی، جو ساری دنیا کے لئے نمونۂ عمل تھی، اس قوم نے بھٹکی ہوئی مخلوق کو راہ راست پر لگایا، اور جب تک قوموں کی قیادت اس کے ہاتھوں میں رہی، دنیا میں خدا شناسی، خشیت الٰہی اور مذہب و اخلاق کا اثر باقی رہا، اور پرانی جاہلیت لوٹنے نہ پائی، مگر اس کے زوال کے بعد مغربی قوموں نے اس کی جگہ لی، جن کا نقطۂ نظر تمام تر مادی اور نفس پرستی تھا، اور جس میں خدا شناسی کا کوئی شائبہ نہ تھا، اس لئے پرانی جاہلیت نئے لباس میں پھر ابھر آئی، اس کے چہرہ پر علم و تہذیب اور خوشنما الفاظ و اصطلاحات کی زرین نقاب تھی، اس کے

وہ جاہلیت اولیٰ سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور اس کے دام فریب سے بچنا بہت مشکل تھا، اس لئے وہ اپنی ظاہری دلفریبی کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیل گئی، اور انسانیت پھر اسی اخلاقی پستی کے گڈھے میں گر گئی جس سے اسلام نے اس کو نکالا تھا، ان مباحث میں مصنف نے ظہور اسلام کے قبل سے لیکر یورپ کی نشأۃ ثانیہ بلکہ موجودہ دور تک اقوام و ملل کی پوری سیاسی، مذہبی و تمدنی تاریخ کھنگال ڈالی ہے، یہ کتاب آٹھ بابوں میں تقسیم ہے، پہلے باب میں دکھایا گیا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے قوموں اور ملتوں کی مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی حالت کتنی پست اور انسانیت کتنی مسخ ہو چکی تھی، دوسرے باب میں ظہور اسلام اُسکی انقلاب انگیز تعلیمات اور اسکی تربیت یافتہ سوسائٹی کی اخلاقی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، تیسرے باب میں دنیا میں اسلام کے انقلاب انگیز اثرات و نتائج پر تبصرہ ہے، چوتھے باب میں مسلمانوں کے تنزل کی سرگذشت اور اُس کے اسباب تحریر کئے گئے ہیں، پانچویں باب میں مغربی قوموں کی قیادت اور اس کے نتائج کی تفصیل ہے، اس سلسلہ میں یورپ کے قرون وسطیٰ سے لیکر اسکی نشأۃ ثانیہ تک اس کی اجمالی تمدنی تاریخ آگئی ہے، اور تاریخی شواہد سے دکھایا گیا ہے کہ جدید مغربی تمدن کی بنیاد یونان و روما کی قدیم بت پرستانہ اور مادی تہذیب پر تھی، پھر بعد میں اس میں جو تغیرات ہوئے اس میں بھی خاص حالات کی بنا پر اس کا قدم مادیت ہی کی طرف بڑھتا گیا، عیسائیت اس میں اصلاح کر سکتی تھی، مگر یورپ میں جو عیسائیت پہنچی، وہ خود رومیوں کے اثر سے بت پرستی سے متاثر تھی، پھر پال نے اس کو اور زیادہ مسخ کر دیا تھا، مذہب میں افراط و تفریط نے اور بھی برے نتائج پیدا کئے، اور رہبانیت کے رد عمل نے خود ارباب کلیسا کو عیش پرست اور دنیا دار بنا دیا، وہ مذہبی اجارہ داری کے ساتھ حکومت و سیاست پر بھی حاوی ہو گئے، اور اپنے دور اقتدار میں انھوں نے بڑی سفاکیاں کیں، اسی زمانہ میں یورپ کی علمی ترقی کا آغاز ہوا، ارباب کلیسا نے اپنی تنگ نظری سے اس میں بڑی رکاوٹ پیدا کی، اور علماء و محققین پر بڑے مظالم ڈھائے جس کا نتیجہ کلیسا کی مخالفت اور بالآخر اس کے اقتدار کے خاتمہ کی شکل میں ظاہر ہوا، کلیسا کے مظالم کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدید یورپ سرے سے مذہب ہی کے خلاف ہو گیا، اور اُس نے جدید تمدنی نظام میں اسکو

کوئی جگہ نہ دی، اور تہذیب جدید کی تعمیر خالص مادی اصولوں اور نظریوں پر ہوئی جس کا مقصد صرف مادی ترقی، حصول دولت اور دنیاوی عیش و تنعم سے لطف اندوزی تھا، خدا شناسی، خوف آخرت اور اخلاق و روحانیت کا اس میں کوئی شائبہ نہ تھا، اور وہ مادیت اور اسکی پیدا کردہ خرابیوں کا مجموعہ تھی، اس لئے اس کے بظاہر مفید پہلو بھی انسانیت کی فلاح میں ناکام رہے، چنانچہ سائنس کے انکشافات اور اس کی ترقیاں کہ انسانوں کے لئے رحمت سے زیادہ زحمت اور ان کی تباہی و بربادی کا سامان بن گئیں، زندگی کے اس مادی تصور نے انسانوں کو خود غرضی، آز و ہوس کا پتلا اور نسل و وطن کی پرستش اور نسلی و وطنی برتری کے جذبہ نے قوموں اور ملکوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا، اور دنیا سے امن و سکون اُٹھ گیا، چھٹے باب میں دکھایا گیا ہے کہ مغربی قوموں کے اقتدار کے ساتھ یہ مادی تمدن اور اسکی خرابیاں ساری دنیا میں پھیل گئیں، ساتویں باب میں مسلمانوں اور مغربی قوموں کی قیادت کے نتائج پر اجمالی تبصرہ ہے، اور مسلمانوں خصوصاً دنیائے عرب کو پھر دنیا کی اصلاح کے لئے میدان میں آنے کی دعوت دی گئی ہے، اور اس کے لئے جس تربیت، جن اخلاقی اوصاف اور جس دنیاوی سر و سامان کی ضرورت ہے اُن کے حصول پر آمادہ کیا گیا ہے، یہ اس کتاب کا اجمالی خاکہ ہے، مگر اس کی خوبیوں کا پورا اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، یہ کتاب اپنے مباحث و فوائد اور موجودہ دور کے اہم مسائل کے حل کے لحاظ سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کے مطالعہ کے بھی لائق ہے،

ساحل اور سمندر از جناب پروفیسر احتشام حسین صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۳۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ، پتہ: سرفراز قومی پریس لکھنؤ،

لائق مؤلف دو سال ہوئے امریکہ گئے تھے، وہاں کئی مہینے ان کا قیام رہا، اور اُس کے تمام بڑے بڑے شہروں کو دیکھا، واپسی میں وہ ڈھائی مہینے لندن میں ٹھہرے اور اس درمیان میں پیرس کی بھی ایک جھلک دیکھی، اس سفر میں انھوں نے امریکہ اور لندن خصوصاً امریکہ کے متعلق ہر قسم کے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، وہاں کے ادیبوں اور اصحاب علم و قلم سے ملاقاتیں اور تبادلۂ خیالات کیا، کالجوں، یونیورسٹیوں، کتب خانوں، میوزیم، آرٹ

گیلریون اور مختلف قسم کے اداروں کو دیکھا، اُن کے اجتماعات مین شرکت کی، علمی، ادبی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کا مشاہدہ کیا، دولت و ثروت اور مادی ترقیون کے مظاہر و عجائبات دیکھے، غرض طالب علمانہ جستجو کے ساتھ امریکہ کے ہر رُخ پر نگاہ ڈالی، اور جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، اور جو تجربات و مشاہدات ان کو ہوئے اُن کو روزنامچہ کی شکل مین لکھتے گئے، اور اب اسی کو کتابی شکل مین شائع کر دیا ہے، کتاب کے آخر مین امریکہ کی استعماری اور سرمایہ دارانہ سیاست، اُس کی تہذیب و معاشرت، وہان کی علمی و ادبی رفتار اور امریکی ذہنیت کے مختلف پہلوؤن پر مختصر تبصرہ ہے، لندن کے متعلق بھی خاصے معلومات ہین، پیرس کا تذکرہ محض سرسری ہے، اس طرح یہ روزنامچہ یا سفرنامہ امریکہ اور لندن کے متعلق مفید و سنجیدہ معلومات، اور تفریحی حالات کا دلچسپ مجموعہ ہے، اور اس مین ہر ذوق کا سامان مل جاتا ہے، جس سے اہل نظر اور عام تماشائی دونون لطف اندوز ہو سکتے ہین، کتاب کا انداز تحریر مصنف کی فطری متانت و سنجیدگی اور سادگی و تواضع کا آئینہ دار ہے، جو اُن کے معاصرین مین کمتر نظر آتی ہے،

نادر روزنامچہ مرتبہ جناب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عه، پتہ نمبر ۳۷، امین آباد پارک لکھنؤ،

پُرانے زمانہ مین روزنامچہ لکھنے کا بڑا مذاق تھا، اور اکثر پڑھے لکھے لوگ روزنامچہ لکھا کرتے تھے، روزنامچہ سے زیادہ مستند دوسری تاریخ نہین ہو سکتی، اس لئے یہ دستور بہت مفید تھا، مگر اب اس کا مذاق باقی نہین رہا، اردو مین معلوم نہین کتنے روزنامچے لکھے گئے، مگر وہ سب کیڑون اور ردی کی نذر ہو گئے، سندیلہ کے ایک بزرگ مولوی سید مظفر علی صاحب بھی پابندی سے روزنامچہ لکھا کرتے تھے، جو ۱۸۶۶ء سے لیکر اُن کی وفات دسمبر ۱۹۱۷ء تک تقریباً نصف صدی کے حالات پر مشتمل ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ روزنامچہ کے سب واقعات سے عام لوگون کو دلچسپی نہین ہو سکتی، اور نہ سب کے سب مفید اور کارآمد ہی ہوتے ہین، اس لئے مصنف کے پوتے نور الحسن صاحب ہاشمی نے ان مین سے ان واقعات کا انتخاب کر کے جو ہندوستان اور بیرونی ملکون کی تاریخ،

یا مصنف کے ذاتی و مقامی اور اس زمانہ کے معاشرتی حالات سے تعلق رکھتے ہین، اور دوسرون کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتے ہین، نادر روزنامچہ کے نام سے شائع کر دیا ہے، مصنف بڑے ہوشمند اور تجربہ کار تھے اور انھون نے اپنی ذاتی محنت و قابلیت سے معمولی حالت سے بڑی ترقی کی، اور اس سلسلہ مین انھون نے بڑی تجربہ کی باتین لکھی ہین، اس لئے اُن کے ذاتی حالات بھی سبق آموز ہین، اور اس روزنامچہ سے بہت سے پُرانے مفید اور دلچسپ حالات و واقعات پر روشنی پڑتی ہے، جس سے پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے ماضی کی دنیا سے افسانہ مین پہنچ جاتا ہے، اس لئے یہ روزنامچہ اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، مرتب کے قلم سے مصنف اُن کی اولاد اور وطن کا بھی مختصر تذکرہ ہے، اور روزنامچہ مین جن اشخاص اور مقامات کے نام آئے ہین، اُن کی تشریح کر دی گئی ہے،

مسلمان از جناب مولوی قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۲، پتہ قاضی اطہر صاحب مدینہ ذو نارٹ بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳،

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفہ ہارون رشید کو ایک طویل خط لکھا تھا، جس مین اُس کو مختلف قسم کی دینی اور دنیوی نصیحتین کی تھین، یہ خط اسلامی زندگی کا پورا دستور العمل ہے، اور اس مین ایک مسلمان کی انفرادی و اجتماعی مذہبی و معاشرتی زندگی کے متعلق قرآن مجید اور احادیث نبوی کے احکام و تعلیمات تحریر کی گئی ہین، یہ اصل خط "رسالہ مالک الی الرشید" کے نام سے چھپ چکا ہے، اور اس کا اردو ترجمہ بھی عرصہ ہوا پنجاب سے شائع ہو چکا ہے، مگر وہ بہت پُرانا، اور اب نایاب بھی ہے، اس لئے قاضی اطہر صاحب نے اس کا نیا سلیس ترجمہ یا تلخیص شائع کی ہے، یہ رسالہ گو مختصر ہے مگر مفید ہے،

پیام ساوتری از جناب شیام موہن لال جگر بریلوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

جس زمانہ مین اردو مثنویان لکھی گئی ہین، اس زمانہ مین سوسائٹی کا مذاق بہت بگڑا ہوا تھا اس لئے اسی کا

عکس ان مثنویوں میں بھی آیا، اور ایک دو مثنویوں کو چھوڑ کر ان میں عورتوں کے اخلاق و سیرت کی بہت بُری تصویر پیش کی گئی ہے، جناب جگر بریلوی نے پیامِ ساوتری لکھکر اردو میں مثنوی نگاری کا ایک بلند اور اخلاقی نمونہ پیش کیا ہے، اس میں ہندوستانی خاتون کے مشہور نسوانی کیرکٹر ساوتری دیوی کا قصہ نظم کیا گیا ہے، جس کی زندگی کا ہر پہلو ایک عورت کے لئے درسِ اخلاق کی حیثیت رکھتا ہے، مصنف ایک کہنہ مشق اور استادِ فن شاعر ہیں، اس لئے ادبی اور شاعرانہ حیثیت سے بھی یہ مثنوی اتنی مکمل ہے کہ زبان و بیان کی خوبیوں کے لحاظ سے اردو کی قدیم مشہور مثنویوں کے پہلو بہ پہلو رکھی جا سکتی ہے، اس سے بھی بڑھ کر مصنف کی صاحبزادی شریمتی شوکماری دیوی ورما کا مقدمہ ہے، جس میں مثنوی کے ادبی و اخلاقی پہلوؤں پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، اور یہ دیکھ کر مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں بھی ایسی ہندو عورتیں موجود ہیں، جو اردو شعر و ادب اور تحریر و انشاء کا ایسا ستھرا اور بلند مذاق رکھتی ہیں، اگرچہ یہ پرانی باقیات صالحات ہیں، جن کے بعد عورتوں کیا شاید مردوں میں بھی اس کی مثالیں مل سکیں گی۔

آہنگِ سرمدی از جناب ام مظفر نگری تقطیع اوسط ضخامت ۱۸۰ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ :- مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد، دہلی،

گیتا کا ترجمہ تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں ہو چکا ہے، اور فارسی خصوصاً اردو میں اس کے متعدد ترجمے موجود ہیں، ان میں فیضی کا فارسی کا ترجمہ زبان و بیان کی خوبیوں کے لحاظ سے مشہور ہے، جناب ام مظفر نگری نے اس کی مدد سے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے، وہ خود بھی ایک قادر الکلام شاعر ہیں، اور انھوں نے فیضی کے ترجمہ کو پیش نظر رکھ کر اس نے اصل کی ادبی و معنوی خوبیوں کو قائم رکھنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے، اور ترجمہ کا بیشتر حصہ اتنا سلیس اور سلجھا ہوا ہے کہ گیتا کے دقیق عارفانہ اور فلسفیانہ مسائل کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، اور ادبی محاسن کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا ہے، کتاب کے شروع میں مترجم کے قلم سے گیتا پر مختصر تبصرہ اور حواشی میں اس کے اسمائے اعلام اور فلسفہ اور دیانت کی اصطلاحوں کی تشریح کر دی گئی ہے، جس سے ان کے سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے،

مکتبۂ دار المصنفین

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخ اسلام (حصہ اول) عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ، یعنی آغازِ اسلام سے لے کر خلافتِ راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ قیمت ...

تاریخ اسلام (حصہ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت ...

تاریخ اسلام جلد سوم (خلافتِ عباسیہ) یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت :- ...

تاریخ اسلام جلد چہارم (خلافتِ عباسیہ جلد دوم) اس میں مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافتِ عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور آخر میں ایک مستقل باب میں عباسیوں کے تمدنی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ ضخیم اور مکمل ہو گئی ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت :-

نئی کتابیں

تاریخِ سندھ : سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی و تمدنی تاریخ، قیمت : ...

اقبالِ کامل، ڈاکٹر اقبال کے سوانحِ حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل ...

بزمِ تیموریہ : تیموری بادشاہوں، شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء و شعراء اور فضلاء کے مختصر تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت : ...

امام رازی : امام فخر الدین رازی کے سوانح و حالات، انکی تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام و تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت : ...

بزمِ صوفیہ : عہد تیموریہ سے پہلے کے صاحب تصنیفات صوفیائے کرام مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیاء وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات قیمت ...

تاریخ اندلس جلد اول، اندلس کے عہد بعہد کی مفصل سیاسی تاریخ نیز اندلس کی علمی و تمدنی تاریخ قیمت ...

اہل کتاب صحابہؓ و تابعینؒ یہودی و نصرانی اہل کتاب صحابہ و تابعین کا تذکرہ قیمت : ...